سعادت حسن منٹو

روسی افسانے

.... میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی.... میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا، اسلئے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے....

رُوسی افسانے

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعر و ادب ۔ سمن آباد ۔ لاہور

ناشر ______ نواز چودھری

مطبع ______ بُک پرنٹرز، لاہور

کتابت ______ جاوید اقبال چوپالوی

قیمت ______ اٹھارہ روپے

انتساب

"فکرِ احمر" کے نام

مقدمہ

روس کو مغربی تہذیب کا آخری بچہ کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک کی نسبت روس کی نشاۃ ثانیہ دو صدی بعد شروع ہوئی۔ تاہم روس نے ایسے ادیب اور مفکر پیدا کیے ہیں جن پر فکرِ انساں نازاں ہے۔ انیسویں صدی میں روسی مفکروں کی شہرت ماسکو سے نکل کر۔ برلن، پیرس، لندن اور نیویارک تک جا پہنچی۔

انیسویں صدی کے آخری نصف میں روس میں دو ادبی دیو نمودار ہوئے طالسطائی اور داسطوفسکی کی شہرت مملکت زار سے نکل کر اکناف عالم میں پھیل گئی۔ دونوں زندگی۔ کردار۔ نفسیات اور انشاء میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے تاہم دونوں کی تصانیف نے ملتِ احمر، کیلئے بانگ درا کا کام کیا دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف مختلف راستوں سے گامزن تھے۔ دونوں کے افکار و آراء میں حیاتِ نو کی تڑپ موجود ہے۔ دونوں کے ادبی کردار روس، کی متحرک تصاویر ہیں۔

طالسطائی، امیر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن داسطوفسکی مفلوک حال تھا۔ غریب خاندان کے لیے۔ زار کے ایوان عدل سے داسطوفسکی کی موت کا فتویٰ صادر ہوا لیکن بعد میں اُسے سائبریا بھیج دیا گیا۔ ان مصائب نے داسطوفسکی کو انسانی فطرت سے آشنا کر دیا۔

طالسطائی ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا - ابتدائی تعلیم کے بعد وہ قازان یونیورسٹی میں داخل ہوا چند سال بعد وہ سینٹ پیٹرز برگ میں دیکھا گیا - اس کی آوارگی نے طالسطائی کے بھائی نکولس کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے فوجی ملازمت کی ترغیب دے چنانچہ ۱۸۵۱ء وہ کاکیشیا چلا گیا - سبزہ وگل کی کثرت، حسن کی سادگی اور کاکیشیا کی دہقانی دلچسپیوں نے نوجوان ذہن کی خوب تربیت کی حسن وعشق کی اس سرزمین میں طالسطائی نے قلم اٹھا ۱۸۵۴ء میں وہ کریمیا گیا جہاں تلواروں کے سایہ میں اس نے "داستان سبا ستول"، لکھی۔ ۱۸۶۰ء میں نکولس کی موت کے باعث اسے واپس جانا پڑا - دو برس بعد اس نے شادی کی - اسی زمانہ میں "جنگ اور صلح"، اور "اینا کرینا" شائع ہوئیں - ۱۸۷۰ء کے قریب اس کے زاویہ نگاہ میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی اور آرٹ کی جگہ حقیقت نے لے لی - اس نے دہقان کی سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین شروع کی چنانچہ تمدن، ریاست، قانون، کلیسا اور ادب طالسطائی کی نگاہوں انسانیت کے منافی تھے ۱۹۱۰ء میں وہ بے سروسامانی کی حالت میں گھر سے نکل پڑا لیکن بہت جلد ہی وہ ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر بے جان نظر آیا -

روسی افسانوں کے اس مختصر مجموعہ آپ طالسطائی کے دو افسانے "شراب اور شیطان"، اور "تین سوال" پائیں گے -

"شراب اور شیطان" میں طالسطائی نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جب انسان کے پاس

کچھ نہیں ہوتا۔ تو وہ صبر اور سکون سے کام لیتا ہے۔ لیکن جونہی اس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہوا۔ وہ فوراً گناہ اور عصیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کسان اپنا کھانا گم ہونے پر بھی صبر و سکون کے دامن کو ہاتھ سے نہیں کھوتا لیکن جب کسان کے پاس غلہ کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس کا کردار تبدیل ہو جاتا ہے۔ صبر و توکل والا کسان غصہ اور جوش کام میں لاتا ہے۔ اس کی سادگی معصیت اور سیاہ کاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہی شیطان جو غریب اور مفلس کسان کو گمراہ کرنے میں ناکام ہوا۔ کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ غلہ جمع کر لیتا ہے۔ کسان اس غلہ کو غربا میں تقسیم کرنے کی جگہ اس سے شراب نکلتا ہے اور اپنے دوست احباب کو مدعو کرتا ہے شراب پینے کے بعد تمام مے نوش ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

بوڑھا شیطان اپنے شاگرد سے دریافت کرتا ہے۔

"شراب کی ایجاد خوب رہی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ شراب وحشیوں اور درندوں کے خون سے تیار کی ہے!!"

شاگرد جواب میں ترغیبِ گناہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"نہیں استاد! اہیں درندوں وغیرہ کا خون نہیں میرے لئے سب سے ضروری چیز یہ تھی۔ کہ کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہو۔ وحشیوں اور درندوں کا خون تو انسان میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ جب اس کے پاس ضرورت سے زیادہ

ہو۔ تو وہ خون اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے"

طالسطائی کا دوسرا افسانہ "تین سوال" ہیں۔ اس افسانہ میں قدیم اخلاقی جھلک اور حقیقی طالسطایت نظر آتی ہے۔

۱ کسی کام کو شروع کرنے موزوں وقت کیا ہے؟

۲ کن اشخاص سے صحبت رکھنی چاہیئے؟

۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری کام کیا ہے؟ طالسطائی ان سوالوں کا جواب اس طرح دیتا ہے۔

"کسی خاص کام کے لیے صرف ایک ہی موزوں وقت ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ ہم اسے سرانجام دے سکیں"۔

"سب سے زیادہ ضروری شخص وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ تم اس وقت موجود ہو۔ کیونکہ اس بات کا معلوم کرنا کہ اس شخص کے سوا تمہیں کسی اور شے بھی واسطہ پڑیگا۔ انسان کے وہم قیاس سے بالا ہے۔ سب سے ضروری اور اہم کام اس شخص سے نیکی کرنا ہے۔ کیونکہ خدا نے انسان کو صرف اسی غرض سے دنیا میں بھیجا ہے"!

جنگ کریمیا کے بعد روس میں اصلاحات کا مختصر زمانہ رہا ۱۸۱۸ء کے بعد وہی حالت ہو گئی انگلزنیڈ رتانی سے قبل تھی "آزاد خیال" جماعت کے حوصلے پست ہو گئے۔ انہیں ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شمع حریت کے گل ہونے سے ملت روسیہ تاریکی میں چھوڑ دی گئی ہو۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔

کہ طالسطائی رجائیت کو خیرباد کہتا ہوا یاس و قنوط میں پناہ لیتا ہے اسی زمانہ کی بہترین تصویر گارشن اور چیخوف کے افسانہ اور ناڈسن کے اشعار میں نظر آتی ہے ۔

چیخوف ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا ماسکو یونیورسٹی سے طب کی اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد اس نے ادبی زندگی شروع کی ۔ وہ ابتدا میں مختصر" وکاہی قلمی چہرے مختلف جرائد میں اشاعت کے لیے بھیجتا رہا ۔ آہستہ آہستہ اس نے افسانے لکھنے شروع کیے ۔ افسانوں میں مزاحیہ رنگ یک قلم غائب نظر آتا ہے چیخوف کی زندگی پژمردگی اور خاموش تھی آخری عمر میں اس نے ڈرامہ کی طرف بھی توجہ کی ۱۹۰۴ء میں چیخوف اس جہان سے چل پڑا ۔

چیخوف کے زمانہ میں روس کی اخلاقی حالت بہت پست تھی سیاسی طور پر بھی روس میں آزادی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا ۔ جب گردوپیش یہ حالات ہوں تو چیخوف کے بربط فکر سے سوائے المیہ نغموں کے اور کون سی صدا اٹھ سکتی تھی ۔

چیخوف کے مختصر افسانے روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس کے کردار روزمرہ زندگی کے انسان نظر آتے ہیں اس کا تخیل شاعرانہ مبالغہ سے پاک ہے ۔

۱۸۶۰ء میں ڈارون اور علم الابدان کا چرچا تھا لیکن دس برس بعد مارکس اور اشتمالیت کا تذکرہ ہوا ۔ روس کے ادبی حلقوں میں مارکس نے شمع ہدایت کا کام کیا کیا چیخوف معلم اخلاقیات تھا؟

نہیں! بلکہ وہ آرٹسٹ تھا۔

وہ زندگی کو اس طرح پیش کرتا۔ جس طرح وہ اسے خود دیکھتا۔ وہ اس چنگاری کو جو انسانی سرشت میں پنہاں ہے۔ شعلہ بنانے کی کوشش کرتا۔ وہ ہمیشہ اس امر کی تعلیم دیتا کہ زندگی کی موجودہ مصیبتیں روبہ تغیر ہیں۔ دنیا اس قابل ضرور ہے کہ ہم اس میں رہیں۔ اپنے لئے نہ سہی بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے۔ چیخوف کا خیال تھا کہ چند صدی بعد دنیا مسرت وراحت سے بریز ہوگی۔

ردِّ عمل کے اسی زمانہ میں حال سے مایوس اور مستقبل سے پُرامید فلسفی اور اور متفکر پیدا ہوئے۔ ان لوگوں نے حال کے مصائب کو اس انداز میں بیان کیا کہ ان میں سے بعض جلاوطن کردیئے گئے۔

"خادمہ" میں چیخوف ایک روسی خادمہ وارکا کی داستان غم بیان کرتا ہے۔ وارکا ایک تیرہ سالہ لڑکی ہے۔ جس سے دن بھر کام لیا جاتا ہے۔

وارکا! انگیٹھی میں کوئلے ڈالو۔

وارکا! سماوار گرم کرو۔

وارکا! اپنے آقا کے بڑے بوٹ صاف کرو۔

وارکا! سیڑھیوں کو دھو ڈالو۔

وارکا! تین بوتلیں شراب لاؤ۔

وارکا! گلاس صاف کرو۔

وارکا کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ دن بھر شیر خوار بچہ کو لوری دینا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وارکا کی مالکنے۔ اس کی نیند بھی خرید لی تھی۔

وارکا اپنے آقا کے بڑے لوٹ صاف کرنے کیلئے بیٹھ جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ کیا ہی اچھا ہو۔ اگر وہ اس بڑے لوٹ میں سر ڈال کر تھوڑا سا آرام کرلے۔

لیکن مالکہ کا یہ حکم کہ بچہ کو لوری دو۔ اسے ایک لمحہ بھی آرام کرنے نہیں دیتا۔ آخر کار انسان کی سرشت میں بغاوت کی جو چنگاری ہے۔ وہ بھڑک اٹھتی ہے۔ وارکا اپنی زندگی پر غور کرتی ہے۔ وہ مصیبت کے سرچشمہ کو ہمیشہ کیلئے بند کرنا چاہتی ہے۔

" وہ اس طاقت کو جس نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ جو اس کی چھاتی پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ جو اسے زندہ نہیں رہنے دیتی نہیں سمجھ سکتی۔ اسی طاقت کی جستجو کیلئے اپنے اردگرد نظر دوڑاتی ہے تاکہ اس کی گرفت سے آزاد ہو سکے۔ مگر بے سود۔ روشنی کے رقصاں دھبوں اور کپڑوں کے متحرک سائے پر نظر دوڑانے کے بعد وہ اس دشمن کو پالیتی ہے۔ جو اس کی زندگی میں سدّراہ ہو رہا ہے۔

وہ دشمن کون تھا؟ وہ بچہ جسے سلانے کے لیے " سو جاؤ میرے ننھے سو جاؤ " کہتے کہتے وارکا کی زبان تھک جاتی۔ اب یہ الفاظ زبان پر لاتی ہے۔

" بچے کی موت کے بعد نیند ـــــ نیند ـــــ نیند "

وہ نیند کے لیے بچہ کو ہلاک کرتی ہے۔ لیکن اُسے صرف موت کی ابدی نیند حاصل ہو سکتی ہے۔

ہر وہ چیز جو انسان کے لیے تکلیف دہ ہو۔ اسے ختم کر دینا چاہیے خواہ اس کے ختم کرنے میں جان تک بھی قربان کرنی پڑے۔

چیخوف کا دوسرا افسانہ "ایثار" ہے۔ اس میں اس نے معمولی واقعہ سے ثابت کیا ہے۔ کہ کائنات کا انحصار محبت اور صرف محبت ہو سکتا ہے۔

"محبت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موت اور اس کی ہیبت سے کہیں زیادہ ہے۔ اور صرف محبت ہی ایسی چیز ہے۔ جو زندگی کے نظام کو قائم اور متحرک رکھتی ہے" اس افسانہ میں چیخوف کی نسبت طالسطائی کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی کا آخری نصف صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ دہقانی اشتراکیت کا خیال روسی اذہان سے بتدریج محو ہو رہا تھا۔ کسانوں کی جگہ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے حاصل کرلی۔ روسی افسانہ نگاری کی توجہ کسان سے منعطف ہو کر مزدور کی زبوں حالی اور دار گوں بختی میں مرکوز ہو گئی۔ کارل مارکس کے افکار روس کی قدیم "مذہبی اشتراکیت"، کا خاتمہ کر دیا۔ اس زمانہ کے گلستان ادب میں گورکی نے باد نسیم کا کردار ادا کیا۔ شباب مستقل مزاجی اور فکر جدید کے ساتھ گورکی روس کے ایوان ادب میں داخل ہوا۔ ——— شاید کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے ———

گورکی کے افسانوں نے ایک جدید خیالستان کی طرح ڈالی گورکی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے چند روز بعد گورکی کا والد انتقال کر جاتا ہے۔ اس

کی پرورش اس کے دادا کے سپرد ہوئی مستقل کا مفکر کفش دوز کی دوکان سے بھاگ کر ایک جہاز میں ملازم ہونے کے بعد نانبائی کے ہاں پناہ لیتا ہے۔ قدرت کو یہ مقصود نہ تھا۔ کہ گورکی کفش دوزی کرے۔ بلکہ وہ حکمت کے ۔۔ ایسے خیمے تیار کرے جو سقف نیلوفری کے نیچے "ادبی جنت،، کا کام دیں۔

گورکی کا ذہنی تلاطم اسے روس کی سرحدوں پر لیئے پھرا۔ وہ خانہ بدوش سیاحوں میں شامل ہو کر بحیرہ اسود تک جا پہنچا ۱۸۹۲ء میں اس مقام پر اس کی پہلی تصنیف "سیاحت" شائع ہوئی۔ چند مزید تصانیف کے لئے گورکی کی شہرت تمام روس میں پھیل گئی ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصہ لینے کے باعث اُسے سرزمین روس کو خیرباد کہنا پڑا۔ روس چھوڑنے کے بعد اس نے مرزبینی اور گیری بالڈی کے وطن میں اقامت اختیار کی ۱۹۱۷ء میں زاریت کے خاتمہ کے لیے گورکی روس میں دوبارہ داخل ہوا گورکی کا قلم اس وقت مختلف قوتوں کے خلاف مصروف پیکار ہے۔ اشتراکی روس میں لینن کے بعد گورکی قابل احترام شخصیت ہے جس طرح انیسویں صدی میں ہیوگو کے افکار نے نوجوان قلوب پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اسی طرح بیسویں صدی کا نوجوان گورکی کے افکار و آرا اور فلسفہ حیات سے مسخر ہو چکا ہے۔

"مزدور کی شکست" میں ہم اپنے تئیں ایک تنگ و تار غار میں پاتے ہیں۔ جہاں صبح سے شام تک نانبائی کام کرتے ہیں۔ روزمرہ کی یکطرف وہ زندگی اور شدت ان چھبیس ۲۶ متحرک مشینوں کو انسانیت کے دائرہ سے خارج کر دیتی ہے۔

اگر ان کا تلخ جام حیات کسی کی مستی بھری آنکھوں سے آبِ زندگی میں تبدیل نہ ہوتا ان کی زندگی حیوانوں سے بدتر ہوتی ہے۔ اگر مضرابِ حُسن ان کے سازِ حیات سے ہر روز نہ ٹکراتی۔ وہ سب کے سب محض مشیتی انسان ہوتے اگر ٹاٹنا اُن کے خوابیدہ جذباتِ الفت کو اپنی حسین نگاہوں سے بیدار نہ کرتی۔ وہ مٹی کے بت ہوتے۔ اگر وہ ان سے ہمکلام نہ ہوتی۔ ان کے محفلِ حزن میں ابدی سکوت طاری رہتا۔ مگر روسی دوشیزہ ان سے جدا کر دی جاتی ہے۔ وہ ظالم آقا کے جور و ستم سے بے حس حیوان تھے۔ لیکن ٹاٹنا کے درسِ الفت نے انہیں انسانیت سے آشنا کر دیا۔

ایک آوارہ مزاج اور اوباش ان چھبیس مزدوروں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ یہ خوش گل اور خوش پوش مگر بدکردار انسان دعوے کرتا ہے۔ کہ کوئی حسینہ اس کے دام فریب میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی چھبیس بے کس انسان اپنی منتر کہ محبوبہ کی اخلاقی جرأت پر اعتبار کئے ہوئے تھے۔ اعتماد نے انہیں دھوکا دیا ایک وضعدار ان کی امیدوں کے مرکز کو مٹا کر دائرہ حیات تنگ کر دیتا ہے شمع امید گل ہونے کے بعد وہ پھر تاریکی میں نظر آتی ہیں۔ اس افسانے سے گورکی کا شاید یہ مقصد ہو کہ کس طرح ایک پاک اور متبرک جذبہ ناہنجار لوگوں کی مداخلت سے ناپاک اور غیر متبرک صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جس بھٹی میں دن بھر چھبیس ۲۶ مزدور کام کرتے ہیں۔ اسے گورکی ان الفاظ

میں بیان کرتا ہے۔

"صبح سے لیکر شام تک آتشکدہ کیطرف دیکھتی رہتی جس کی سرخ شعاؤں کا عکس دیوار پر اس طرح رقص کرتا معلوم ہوتا جیسے وہ ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش ہنسی ہنس رہا ہو۔ وہ بھٹی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی جو اپنے بڑے حلق سے آگ اگل رہا ہو۔ ہمارے سامنے جہنم کی جھلسا دینے والی گرمی ایسے سانس لے رہا ہو اور ہمارے غیر مختتم کام کو اپنی پیشانی کے دو سیاہ تاریک سوراخوں سے مطالعہ کر رہا ہو۔ یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے ——— آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی اور رحمدلی کے جذبہ سے عاری ہوں۔

یہ آنکھیں ہمیشہ تاریک نظر سے دیکھتیں جیسے وہ اپنے غلاموں کو دیکھتے دیکھتے تنگ آگئی ہو۔ اور اس بات کی توقع چھوڑ دی ہو کہ ہم جنس آدم میں سے ہیں۔

اقبالؔ بلبل شوریدہ کے نالہ کو خام قرار دیتا ہوا اسے اپنے سینہ میں رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن روسی مفکر خاموشی پر اس طرح اظہار خیال کرتا ہے۔

"خاموشی ان اشخاص کے لیے۔ جو سب کہہ چکے ہوں۔ اور کچھ کہنے کے لیے باقی نہ رکھتے ہوں۔ خوف اور اذیت ہے مگر ان کے لیے جو ابھی تک اپنی آواز سے ہی ناآشنا ہوں۔ خاموشی بجائے تکلیف دہ ہونے کے آسان

اور راست رساں ہے۔"

چھبیس مزدوروں کی حالت بیان کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"اسی دوران میں آگ کے شعلے بھٹی میں سرخ زبان نکال رہے ہوتے۔ نانبائی کی آہنی سلاخ بھٹی کی زرد اینٹوں پر تیز آواز میں کھیل رہی ہوتی۔ اُبلتا ہوا پانی بدستور جاری رہتا اور شعلوں کا عکس دیوار پر رقصاں خاموش ہنسی ہنس رہا ہوتا ——
اور ہم کسی غیر کے لفظوں میں ان انسانوں کا دکھ درد بیان کرتے میں مصروف ہوتے جن سے سورج کی روشنی چھین لی گئی ہو —— جو غلام ہوں ——
یہ تھی ہماری زندگی —— چھبیس ۲۶ غلاموں کی زندگی اس قفس میں، جس میں زندگی کے ایام اس قدر تلخ گزر رہے تھے کہ معلوم ہو رہا تھا کہ سنگین مکان کی منزلیں ہمارے کندھوں پر تعمیر کی گئی ہیں۔" "انسان کے دل میں حسن کے احترام کے جذبات ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔

"ہر حسین چیز انسان کے دل میں وقعت اور عزت پیدا کر دیتی ہے ——
خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو"

گورکی ادبیاتِ روس میں ہر روز نمایاں اضافہ کر رہا تھا۔

جہاں تک پرواز تخیل کا تعلق ہے۔ اندریف کے بعد سلوگب کا درجہ ہے۔ سلوگب ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا ۱۸۹۵ء میں اس نے اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۰۵ء میں خورد سال شیطان شائع ہوئی۔ اس وقت

یک سلوگب متعدد ناول ڈرامے اور افسانے لکھ چکا ہے مختصر افسانہ نگاری میں وہ اپنے ہمعصروں میں سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔

اقبال پیام مشرق میں:- ابدی جہد (جدو) حیات اور سرمدی تنازع البقالیوں واضح کرتا ہے۔

بطے می گفت بحر آزاد گردید،
چنیں فرمان زدیوان خضر رفت
نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی
ولے از ما نباید بےخبر رفت۔

سلوگب "مساوات" میں یہی خیالات پیش کرتا ہے۔

"پتھر کی سرگذشت" میں سلوگب شاید یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قوتِ ارادی سے انسان منزلِ مقصود پر پہنچ کر جب مقصدِ حیات سے غافل ہو جاتا ہے تو مخالف قوتیں اسے پسپا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ غفلت انسان کے لئے پیامِ مرگ ہے۔

گر بقدر یک نفس غافل شدی
صد فرسنگ از منزل شدی۔

(اقبال)

چیخوف بونن کی طرح حیات انسانی کا عمیق ناظر ہے اس کے افسانوں

میں تازگی اور مسرت کے باوجود غم کی لطیف جھلک نظر آتی ہے۔

"جادوگر" میں مزدوروں کی ہڑتال کا منظر پیش کرنے کے بعد ایک بچے کی نفسیات بیان کی گئی ہیں۔ جو اپنی ماں سے دریافت کرتا ہوا مزدوروں کی حمایت کرنا چاہتا ہے مگر ماں اسے زیادہ گفتگو کا موقعہ نہیں دیتی ماں اور بچہ مارے خوف کے ایک گاڑی پر سوار ہو جاتے ہیں کوچوان اور مادام کی گفتگو سے تھامس رگ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مزدور اچھے ہیں یا برے۔

کوچوان اور آگنیش کا کردار انقلاب کی فطری خواہش کا آئینہ دار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس کا ہر متنفس تبدیلی کا خواہاں ہے۔

دو روز بعد ہڑتال عام ہو گئی بالکل اشیاء خوردنی تک بھی مہیا نہ ہو سکتی تھیں۔ مرگ کو صبح کے وقت بسکٹ نہ ملے۔ تو اس کے دماغ میں مزدوروں کے خلاف حقارت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے تاہم وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ مزدور اچھے ہیں یا برے ——— وہ مزدوروں سے خوف زدہ ضرور تھا۔ جب تھرگ کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی خادمہ کا خاوند مزدور ہے۔ تو وہ مزدور کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے وہ مزدور جس نے شہری آبادی پر عرصہ حیات تنگ کر دیا کسقدر خوفناک اور بہادر ہو گا لیکن اکیلے مزدور کی زبوں حالی دیکھنے کے بعد بچے کے دل سے مزدوروں کا خوف زائل ہو گیا۔

مزدور کی اجتماعی قوت ایوانِ حکومت کو متزلزل کر سکتی ہے لیکن تنہا مزدور ایک

خوفزدہ بچے کو بھی مرعوب نہ کر سکا۔

کسی ملک کا آرٹ اور لٹریچر اس کی رفتارِ حیات کا مظہر ہوا کرتا ہے جس طرح زندگی صنعتی اور سیاسی اور مجلسی انقلابات سے گزرتی ہے اسی طرح ادب متوازی مدارج طے کرتا ہے۔ روس ایسی زراعتی سرزمین کے اچانک صنعتی ملک ہو جانے سے وہاں سینکڑوں تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ قدیم نظریے ختم کر دیے گئے زاری و قیصری سرداری و سکندری کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ادبیات میں ٹالسٹائیت کی خشک اخلاقیات کی جگہ گورکی کے جان آفریں اور حریت پرور افکار نے حاصل کی مذہب کلیسا اور عبادت کی جگہ "اشتمالیت" کارخانہ اور محنت نے لی۔

"روسی افسانوں" کے مترجم سعادت حسن اس سے پیشتر شہرہ آفاق فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو کی کتاب کا ترجمہ "سرگذشتِ اسیر" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے متعلق ہندوستان کے بہترین ادبی رسائل جرائد نے نوجوان مترجم کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا۔ اب اس کا نام پھانسی ہے۔

روسی افسانوں میں "مساوات"، "پیتھر کی سرگذشت"، "جاگیردار"، "شراب" اور "شیطان"۔ ہندوستان کے ممتاز ادبی رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہو چکے ہیں۔

"سرگذشتِ اسیر" کی طرح مترجم نے شوکتِ ترکیب تسلسل اور زورِ بیان اور روانی کو ترجمہ میں بدستور جاری رکھنے کی کامیاب سعی کی ہے

روسی ادب کے مطالعہ کے بعد مترجم نے روسی طرز کا ایک مختصر درطبع زاد" افسانہ "تماشا" لکھا ہے افسانہ کا محلِ وقوع امرتسر کی جگہ ماسکو نظر آتا ہے۔

خالد نقاب پوش ہندوستانی خاتون کا بچہ ہونے کی نسبت سُرخ دامن کا پروردہ دکھائی دیتا ہے۔

باری

"دارالاحمر" امرتسر،

سپاہی اور موت

"افانسیف"

سپاہی اور موت

پچیس سالہ خدمات کے دوران میں سپاہی کے برخلاف افسران بالا کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملا تھا۔ اس نے اپنی خدمات بڑی تندہی اور جانفشانی سے سرانجام دی تھیں۔ لیکن جب اس نے چاہا کہ نوکری سے مستعفی ہو کر زندگی کے بقایا ایام آرام سے گزارے تو افسران بالا نے اس کی درخواست رد کر دی۔

" میں خدا اور زار کی پورے پچیس سال خدمت بجالایا ہوں۔ اور اس دوران میں میرے متعلق کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ مگر اب جب کہ میں چاہتا ہوں کہ چند دن آرام سے گزاروں۔ تو انہوں نے میری درخواست مسترد کر دی ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ یہاں سے بھاگ نکلوں" سپاہی نے بڑی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا۔

چنانچہ وہ ایک دن بھاگ نکلا۔ تین دن کی بھاگم بھاگ کے بعد اسے راستے میں خدا ملا۔

" کیوں میاں سپاہی؟ کہاں جا رہے ہو؟" خدا نے سپاہی سے دریافت کیا

" میرے مالک! میں پورے پچیس سال تک اپنی خدمات ایماندارانہ بجالایا ہوں۔ مگر اب وہ میرا استعفٰے قبول نہیں کرتے۔ اس لیے میں ان سے بھاگ رہا ہوں۔"

" جب تم نے پچیس سال تک اپنی خدمات بطریق احسن سرانجام دی ہیں۔

لو آؤ تمہیں اجازت ہے۔ کہ میری بادشاہت میں داخل ہو جاؤ ـــــــ بہشت کے دروازے تم پر کھلے ہیں"۔

چنانچہ بہشت کے دروازے کھل گئے۔ سپاہی اندر داخل ہو گیا۔ بہشت کی لطیف فضا اور پر کیف مناظر کو دیکھ کر دل میں کہنے لگا۔

"زندگی اسی کا نام ہے۔"

باغوں میں ٹہلتا ہوا فرشتوں کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا" کیا آپ تمباکو بیچنے والے کی دوکان بتا سکتے ہیں؟"

"کونسا تمباکو ـــــــ میاں! تم اس وقت فوج میں نہیں ہو۔ یہ بہشت ہے ـــــــ خدا کی بادشاہت میں تمباکو کہاں؟"

سپاہی چپ ہو گیا ـــــــ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر اُن فرشتوں کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "تو پھر یہی تبلا دیجیے شراب کہاں ملتی ہے۔؟"

"او خاکی پتلے ـــــــ ترا ابھی تک یہی خیال ہے کہ تو فوج میں ہے بہشت میں شراب کہاں۔؟"

"یہ بہشت کس طرح ہو سکتا ہے۔ جہاں شراب اور تمباکو ہی نہیں ملتا" یہ کہہ کر وہ بہشت سے باہر چلا گیا ـــــــ وہ ایسی جگہ رہنے کو تیار نہ تھا۔ جہاں شراب اور تمباکو نہ ملے۔ زمین پر وہ بہت عرصہ تک چلتا رہا حتےٰ کہ اس کی خدا سے پھر ملاقات ہو گئی۔

"یہ بہشت کیسی جگہ ہے میرے خدا ——— جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا وہاں تمباکو اور شراب ہی ملتی۔"

"بہت اچھا ——— اپنے داہنے ہاتھ کو چلے جاؤ تمہیں وہاں ہر ایک شئے مل جائے گی۔"

وہ اپنے داہنے ہاتھ کی طرف چل پڑا ——— راستے میں اسے بدروح ملی۔

"میاں سپاہی! کسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

"پہلے مجھے کسی جگہ لے چلو ——— تاکہ اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔"

چنانچہ سپاہی کو وہ ناپاک روح ایک گمنام جگہ لے گئی۔

"آپ کے ہاں تمباکو ہے کیا؟ سپاہی نے ناپاک روح سے دریافت کیا۔

"ہے! میرے اچھے سپاہی۔"

"شراب بھی؟"

"شراب بھی!"

"دونوں لاؤ ——— دونوں چیزیں لاؤ"۔

چشم زدن میں اس ناپاک روح نے دونوں چیزیں حاضر کر دیں۔ جب سپاہی کو دونوں چیزیں مل گئیں تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا "بہشت یہی ہے"۔

لیکن جب وہ گھومنے کیلئے باہر نکلا تو اسے بہت سی ناپاک روحیں نظر پڑیں جنکی شکلیں دیکھ کر وہ گھبرا گیا ——— چند دنوں کے بعد اس قدر

اداس ہوا کہ سوچنے لگا۔ کیا کرے۔''

اچانک ایک روز اس کے دماغ میں ایک عجیب خیال آیا۔ لکڑی کا ایک گز بنا کر زمین ماپنے لگا۔ کہ شیطان دوڑتا ہوا آیا اور پوچھنے لگا۔'' کیا کر رہے ہو؟''

''میاں سپاہی کیا اندھے ہو؟ دیکھ نہیں رہے میں یہاں معبد بنانے لگا ہوں!

شیطان دوڑتا ہوا اپنے بوڑھے دادا کے پاس گیا اور چلا کر کہنے لگا۔''

''محترم دادا ہم تباہ ہو گئے ———— یہ انسان یہاں معبد بنانے لگا ہے۔''

''یہ سن کر بوڑھا شیطان غصہ سے تھر تھر کانپتا ہوا خدا کے حضور میں گیا اور کہنے لگا'' خداوندا! آپ نے ہمارے پاس کس قسم کا انسان بھیجا ہے جو ہماری جگہ معبد بنانا چاہتا ہے''۔

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ———— تم نے ایسے انسان کو اپنی جگہ میں داخل ہی کیوں کیا؟''

''خداوندا کسی نہ کسی طرح اس سپاہی کو واپس بلا لیجئے''!

''میں اسے کس طرح بلا لوں۔ وہ تو خود چاہتا تھا۔ کہ تمہارے پاس جائے''۔

''آہ! اب ہم ناچیز کیا تدبیر عمل میں لائیں''۔ بوڑھے شیطان نے روتے ہوئے کہا خدا نے بارعب لہجہ میں جواب دیا۔'' جاؤ! کسی نوجوان شیطان کی کھال اتار کر اس کا ڈھول بناؤ۔ اسی ڈھول کی آواز ہی اس سپاہی کو وہاں سے دور کر سکتی ہے''

بوڑھے شیطان نے آتے ہی ایک نوجوان شیطان کو پکڑا۔ اور اس کی کھال اتار کر ایک ڈھول پر منڈلی۔ سب کچھ تیار کر کے اس نے تمام شیطانوں کو اکٹھا کر کے حکم دیا "دیکھو جونہی یہ سپاہی اس جگہ سے بھاگے تم تمام دروازے بند کر لو تاکہ وہ پھر یہاں نہ آسکے"۔

یہ کہہ کر اس نے ڈھول پر ضربیں لگانی شروع کیں۔ ڈھول کی آواز سن کر سپاہی اس جگہ سے اُٹھ دوڑا ـــــــ جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو۔

جونہی وہ دروازہ سے باہر نکلا۔ شیطانوں نے تمام دروازے بند کر لیے۔

سپاہی جب دیکھا کہ اب کہ دروازے بند ہیں تو دستک دینی شروع کی۔

"دروازہ کھول دو ورنہ دیوار پھوڑ کر اندر آجاؤنگا"

"تم ایسا نہیں کر سکتے میرے بھائی ہم تم سے کہیں طاقتور ہیں" شیطانوں نے جواب دیا۔

جب سپاہی نے دیکھا کہ اب اس کا کوئی بس نہیں چلتا تو سر نشتفار بغیر زمین پر چلنا شروع کر دیا۔ دو تین دن کی آوارہ گردی کے بعد اسے پھر خدا ملا۔

"میاں سپاہی کہاں جارہے ہو خدا نے دریافت کیا؟"

"مجھے خود علم نہیں۔"

"تو اب بتاؤ کہاں جانا چاہتے ہو ـــــــ بہشت میں بھیجا تو وہ تمہیں پسند نہیں آیا۔ دوزخ میں گئے تو وہاں تم نہیں رہ سکے اب کہاں جانے

کی خواہش ہے"؟

"میرے خدا مجھے اپنے دربار کا محافظ بنا لے"۔

"بہت اچھا"

چنانچہ خدا نے اسے اپنے محل کے دروازے پر کھڑا کر دیا "دیکھو خیال رہے کوئی شخص اندر نہ آنے پائے"

"بوڑھے سپاہی کو آپ کیا سکھا رہے ہیں ——— آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

سپاہی بہت عرصہ تک دروازہ پر پہرہ دیتا رہا اور کسی کو اندر نہ جانے دیا۔ آخر ایک دن کے بعد "موت" آ گئی۔

"کون گزر رہا ہے" سپاہی نے رک کر پوچھا"

"موت"

"کس کے پاس جا رہی ہو؟"

"خدا کے پاس"

"کس لیئے؟"

"حکم لینے کے لیے کہ آپ کن اشخاص کی جانیں قبض کروں"

"تو تھوڑی دیر کے لیے انتظار کرو۔ میں خدا سے اجازت لے آؤں"

"خداوندا موت دروازے پر کھڑی آپ کے احکام کی منتظر ہے"

"جاؤ! اُسے حکم دو۔ کہ آئندہ تین سال تک وہ بوڑھے انسانوں کو ہلاک کرتی رہے۔" یہ سن کر سپاہی نے خیال کیا۔ کہ اِس طرح تو اس کے بوڑھے والدین بھی ہلاک ہو جائیں گے۔ اس لیے موت کے پاس آ کر کہا" خدا نے تمہیں حکم دیا ہے۔ کہ جنگلوں میں جا کر تین سال تک پرانے اور بوڑھے درختوں کو اکھیڑتی رہو"،

موت یہ سن کر رو پڑی۔ اور کہنے لگی۔ "خداوند میرے ساتھ ناراض ہیں۔ جو مجھے ایسی سزا دے رہے ہیں۔"

یہ کہتی ہوئی موت جنگلوں میں چلی گئی اور تین سال تک جوان اور سرسبز درختوں کو اکھیڑتی ہوئی۔ تین سال کے بعد اپنے آپ کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی پھر خدا کے حضور میں نئے احکام لینے کی خاطر آئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" سپاہی نے موت سے دریافت کیا۔

"خدا کے پاس۔ دریافت کرنے کہ اب کن اشخاص کو ہلاک کروں"۔

"تو تھوڑی دیر کے لیے یہاں انتظار کرو۔ ------- میں ابھی اجازت لے کر آیا"۔

چنانچہ وہ ایک دفعہ پھر خدا کے پاس گیا اور کہنے لگا "خداوندا! موت پھر نئے احکام لینے کی خاطر حاضر خدمت ہوئی ہے"۔

"جاؤ! اُسے کہہ دو کہ وہ تین سال تک چھوٹے بچوں کو ہلاک کرتی رہے"۔ سپاہی نے خیال کیا کہ اس کے تین بچے ہیں۔ اِس طرح وہ بھی مر جائیں گے۔ اس

لیے موت کے پاس آیا اور کہا ،، خدا نے حکم دیا ہے۔ کہ جنگلوں میں پھر واپس جاؤ اور تین سال تک چھوٹے پودوں کو ہلاک کرتی رہو،،۔

،، یہ سن کر موت زارو قطار رونے لگی،، میں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے۔ جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ پھر جنگلوں میں چلی گئی۔ اور تین سال تک چھوٹے پودوں کو ضائع کرتی رہی، تین سال کے بعد لنگڑاتی ہوئی پھر خدا کے حضور میں آئی اور دل میں عہد کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو میں خود خدا کے پاس جاؤں گی۔ اور دریافت کرونگی۔ کہ خدا نے اسے کیوں نو سال تک اتنی سخت سزا دی۔

سپاہی نے موت کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔ ،، کہاں جا رہی ہو،، موت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سیڑھیوں پر چڑھتی گئی۔ جب سپاہی نے دیکھا موت کچھ جواب نہیں دیتی۔ تو اس نے موت کو گردن سے پکڑ لیا اور خدا کے دربار میں نہ جانے دیا۔ موت بہت چیخی چلائی۔ ادھر سپاہی نے بھی خوب شور مچایا۔ خدا یہ شور سن کر باہر آ گیا۔ اور کہنے لگا ،، یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے،،؟

،، خداوند آپ میرے ساتھ اس قدر ناراض کیوں ہیں۔ میں پورے نو سال تک جنگلوں میں سر پٹکتی رہی ہوں۔ تین سال تک سال خوردہ درخت اکھیڑتی رہی۔ تین سال تک جوان اور سرسبز درختوں کو ہلاک کرتی رہی اور اسی عرصہ تک پودوں کو ضائع کرتی رہی ——— آخر ایسی سزا کس گناہ کی پاداش میں؟،،

"یہ سُن کر خدا نے سپاہی کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"

"یہ سب شرارتیں تمہاری معلوم ہوتی ہیں"

"میں معافی چاہتا ہوں ــــــ خداوند!" سپاہی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

"تمہیں سزا دی جاتی ہے کہ موت کو نو سال تک اپنے کندھوں پر ہی اٹھائے پھرو"

حکم ملنا تھا کہ موت سپاہی کے کندھوں پر چڑھ گئی۔ اور سپاہی اسے اٹھائے چل پڑا۔ وہ بہت عرصہ تک موت کو اسی طرح اٹھائے چلتا رہا۔ مگر آخر کار تھک کر چور ہو گیا اور جیب سے نسوار کی ڈبیا نکال کر سونگھنے لگا۔

موت نے دیکھا کہ سپاہی کچھ سونگھ رہا ہے۔ حیران ہو کر کہنے لگی۔

"میاں سپاہی کیا سونگھ رہے ہو ــــــ مجھے بھی دو۔"

"کندھوں سے نیچے اتر آؤ۔ اور ڈبیا میں بیٹھ کر جتنا عرصہ چاہو سونگھو"

"اچھا تو ڈبیا کا ڈھکنا کھول دو۔"

سپاہی نے ڈبیا کا ڈھکنا کھول دیا۔ اور جونہی موت ڈبیا میں آئی جھٹ سے ڈبیا بند کر لی۔ اور ڈبیا کو اپنے بوٹ میں رکھ لیا۔ اتنا کر کے وہ پھر خدا کے دربار میں گیا اور اپنی پرانی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

جب خدا نے اسے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا "ارے! موت کہاں رکھی ہے تم نے؟"

"میرے پاس ہے اے خداوند!"

"تمہارے پاس ہے؟"

"جی ہاں! اس وقت میرے بوٹ میں ہے"

"دکھاؤ تو"

"نہیں جی! یہ نہیں دکھانے کا ۔۔۔۔ اسے نو سال تک وہیں قید رہنا چاہیئے ۔۔۔۔ نو سال تک موت کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے رکھنا کوئی مذاق نہیں ۔۔۔۔ وہیں رہنے دیجئے اسے"۔

"تم اُسے باہر تو نکالو ۔۔۔۔ میں نے تمہاری خطا کو معاف کر دیا"۔

چنانچہ سپاہی نے اپنے بوٹ کے تسمے کھولے اور نسوار کی ڈبیا نکال کر اس کا ڈھکنا کھول دیا ۔۔۔۔ ڈھکنے کا کھلنا تھا۔ کہ موت لپک کر اس کے کندھوں پر سوار ہو گئی ۔

خدا نے موت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تم میں اتنی عقل ہی نہیں کہ اپنا حکم بجا لا سکو۔ اس لئے کندھوں سے اُتر آؤ"۔

"موت کندھوں سے اُتر آئی ۔

لو اب تمہیں حکم دیا جاتا ہے ۔ کہ اس سپاہی کی روح قبض کر لو"۔

"میاں سپاہی! اب مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ"۔ موت نے سپاہی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا ۔

"جلدی کاہے کی ہے، مرنا تو آخر ہے ہی لیکن پہلے مجھے اس وقت کے لیے تیار تو ہو لینے دو۔"

"بہت بہتر۔"

چنانچہ سپاہی ایک سفید کفن اوڑھ کر تابوت میں لیٹ گیا۔

"کیا اب تیار ہو؟" موت نے سپاہی سے دریافت کیا۔

"بالکل"

"اب اچھی طرح تابوت میں لیٹ جاؤ۔"

سپاہی پیٹ کے بل تابوت میں لیٹ گیا۔

"یہ کس طرح لیٹ رہے ہو تم۔؟"

"تو پھر کس طرح لیٹوں؟"

"یہ بھی بھلا کوئی لیٹنے کا طریقہ ہے تمہارے لئے اس حالت میں مرنا درست ہوگا۔" سپاہی پہلو کے بل لیٹ گیا۔

آہ میرے خدا! کیسے بے وقوف انسان سے پالا پڑا ہے۔ کیا تم نے کبھی مردوں کو تابوت میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھا۔ .... نکلو باہر میں تمہیں بتاؤں۔"

سپاہی تابوت سے باہر نکل آیا اور موت اس کو طریقہ بتانے کیلئے تابوت میں لیٹ گئی۔ اس کا لیٹنا تھا۔ کہ سپاہی نے تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔

اور اس پر مضبوطی سے کیل جڑ دیئے۔ اس طرح تمو کو تابوت میں قید کر کے اس نے تابوت کو اٹھایا اور دریا برد کر دیا۔ موت کو دریا کے سپرد کرنے کے بعد اس نے پھر خدا کے دربار پر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ جب خدا نے اسے دیکھا۔ تو حیران ہو کر پوچھا:۔

"ارے! موت کہاں ہے۔"

"میں نے اسے دریا برد کر دیا ہے ـــــ میرے مالک!" خدا نے نظر دوڑائی تو موت کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا۔ اسے دریا سے نکال کر غضبناک لہجہ میں پوچھا۔ "میں نے جو تمہیں حکم دیا تھا۔ کہ اس سپاہی کو ہلاک کر دو۔"

"میرے مالک! یہ سپاہی بہت مکّار ہے۔ میری اس کے سامنے ایک نہیں چلتی۔"

"دیکھو اب اس کے جھانسے میں نہ آنا تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ کہ اس کو فوراً ہلاک کر دو۔"

بعض کہتے ہیں۔ کہ موت نے سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ لیکن بعض خیال کرتے ہیں۔ کہ سپاہی نے موت کو پھر دھوکا دے دیا۔ اور اس طرح بہت عرصہ تک زندہ رہا۔ اور ابھی اسے مرے تھوڑا عرصہ گزرا ہے۔

تین سوال

"طالسطائی"

تین سوال

ایک دفعہ کسی بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ اگر اسے تین چیزیں معلوم ہو جائیں۔ تو اسے کبھی بھی شکست کا منہ دیکھنا نہ پڑے۔ اور جس کام میں ایک دفعہ ہاتھ ڈال دے۔ حسب خواہش انجام پذیر ہو جائے۔ جن تین چیز دل نے اس پر رات کی نیند حرام کر دیں، وہ یہ تھیں:۔

۱۔ کسی کام کو شروع کرنے کا کونسا موزوں وقت ہے۔

۲۔ کن اشخاص سے صحبت رکھنی چاہیئے۔ اور کن اشخاص سے پرہیز۔

۳ دنیا میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری چیز کیا ہے۔

رفتہ رفتہ اس خیال نے بادشاہ کے دل میں جگہ کر لی۔ اور وہ ہر وقت' اسی جستجو میں رہنے لگا۔ کہ کسی نہ کسی طرح اسے ان تین سوالوں کا تسلی بخش جواب حاصل ہو جائے۔

اسی غرض کے لیے اس نے ملک بھر میں منادی کرادی کہ جو کوئی اس کے سوالوں کا صحیح جواب دے گا ـــــ اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائیگا ـــــ اور منہ مانگا انعام پائے گا۔

ملک کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے عالم و فاضل بادشاہ کے حضور میں آئے مگر ان تین سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔

پہلے سوال کے جواب بعض مفکروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کسی کام کے شروع کرنے کا صحیح وقت صرف اسی صورت میں معلوم ہو سکتا ہے جب تک انسان اپنے روزمرہ معمول کے اوقات کو تقسیم کر کے اُس کا ایک نقشہ مرتب نہ کرے بعض عالموں نے اسی سوال کے جواب میں یہ رائے ظاہر کی کہ کسی کام کے لیے موزوں وقت معلوم کرنا اکیلے انسان کے لیے اگر مشکل نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔ اس لیے بادشاہ سلامت کو چاہیے کہ وہ اس غرض کے لیے عالموں کی ایک مجلس مقرر کرے اور ان کی متفقہ رائے پر عمل کرے

لیکن بعض فاضلوں نے اس رائے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ بعض وقت کئی ایسے کام درپیش ہوتے ہیں جن کے لیے اتنا وقت نہیں ہوتا کہ عالموں کی مجلس سے رائے طلب کی جا سکے۔ اس لیے کسی کام کے لیے موزوں وقت معلوم کرنے کے لیے بادشاہ سلامت کو نجومیوں اور جادوگروں سے مشورہ کرنا چاہیے کیونکہ وہی غیب کے علم کو جانتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے سوال کے بھی مختلف جواب ملے۔ بعض نے کہا کہ بادشاہ کو صرف وزرا سے صحبت۔ رکھنی چاہئیے تو بعض نے کہا نہیں ولیوں اور خدا رسیدہ لوگوں کی صحبت ہی یک بادشاہ کے لیے ضروری ہے۔

تیسرے سوال، کے جواب میں کہ دنیا میں سب سے اہم اور ضروری چیز کیا ہے۔ بعض عالموں نے یہ جواب دیا۔ کہ سائنس ہی دنیا میں سب سے

زیادہ ضروری ہے۔

بعض نے یہ کہا کہ آلاتِ جنگ۔ تو بعض نے کہا کہ نہیں خدا کی عبادت ہی سب چیزوں پر مقدم ہے۔ اِس لیے بادشاہ کو خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے

اِن تینوں سوالوں کے جواب بالکل مختلف تھے۔ اس لئے بادشاہ نے اعلان کردہ انعام اُن میں سے کسی کو بھی نہ دیا۔

جب علمائ فضلائ سے خاطر خواہ جوابات نہ مل سکے۔ تو ایک دن بادشاہ نے ایک فقیر کے پاس جو اپنی ریاضت اور بزرگی کے سبب ملک بھر میں مشہور تھا جانے کی ٹھان لی۔ وہ خدا رسیدہ بزرگ آبادی سے دور ایک جنگل میں فروکش تھا۔ جہاں وہ دن رات خدا کی عبادت میں گزارتا۔

چنانچہ ایک دن بادشاہ دہقان کا بھیس بدل کر اس فقیر کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر بادشاہ نے دیکھا کہ فقیر زمین کھودنے میں مصروف ہے۔ بادشاہ کو دیکھ کر فقیر نے سلام کیا۔ لیکن کچھ کہے سنے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

فقیر اس قدر لاغر اور کمزور تھا کہ کدال کی ایک ضرب کے بعد ہی سانس درست کرنے کیلئے تھوڑی دیر ٹھیر جاتا۔

بادشاہ اِس مردِ لاغر کے قریب گیا۔ اور کہا اے عقل مند درویش۔۔۔

میں تیری خدمت میں تین سوال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کیا تو ان تینوں سوالوں کا جواب دے سکتا ہے،،

۱۔ کسی کام کے شروع کرنے کا موزوں وقت کیا ہے۔۔؟

۲ مجھے کن اشخاص کی صحبت رکھنی چاہیے اور کن سے پرہیز کرنا چاہیئے؟

۳ دنیا میں سب سے زیادہ اہم ضروری کام کیا ہیں؟۔

فقیر بادشاہ کی گفتگو کو خاموشی سے سنتا رہا مگر کوئی جواب نہ دیا اور کدال پکڑ کر پھر زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔

"تم کدال چلاتے چلاتے تھک گئے ہو ——— کدال مجھے پکڑا دو۔ اور تھوڑی دیر کیلئے آرام کرلو،، بادشاہ نے فقیر سے کہا۔

"شکریہ،، یہ کہہ کر فقیر نے کدال بادشاہ کو پکڑا دی اور آپ زمین پر ہانپتا ہوا بیٹھ گیا دو کیاریاں کھودنے کے بعد بادشاہ نے اپنے سوالات پھر دہرائے لیکن فقیر پھر خاموش رہا۔ اور بادشاہ کے سوالات کا جواب نہ دیا۔ زمین سے اٹھا اور کہنے لگا "اب آپ آرام فرمائیں۔ میں اس کام کو ختم کر لیتا ہوں۔،،

مگر بادشاہ نے فقیر کو کدال نہ دی اور زمین کھودنی شروع کر دی ———

بادشاہ اسی طرح زمین کھودتا رہا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔ آخر کار تنگ آکر کدال کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "عقل مند درویش میں تیری خدمت میں اس لیئے حاضر ہوا تھا۔ کہ تو میرے سوالات کا جواب دیگا۔

—— اگر تو اُن سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ تو صاف کہہ دے تاکہ میں واپس چلا جاؤں"۔

" وہ دیکھو کون بھاگا چلا آرہا ہے —— " آؤ دیکھیں تو یہ کون ہے" درویش نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بادشاہ نے مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی جنگل کے گھنے درختوں کے باہر اُن کی طرف بھاگا چلا آرہا ہے۔ وہ آدمی اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھا جن سے خون فوارے کی مانند بہہ رہا تھا۔

بادشاہ کے قریب پہنچ کر وہ شخص بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

درویش اور بادشاہ دونوں نے مل کر اس کے کپڑے اُتار دیے تو معلوم ہوا کہ اُس کے پیٹ میں ایک بڑا زخم ہے۔ جس سے خون کافی مقدار میں بہہ چکا ہے بادشاہ نے بڑی احتیاط سے اس زخم کو دھو کر اپنے رومال کی پٹی بنا کر اس پر باندھ دی۔ لیکن پھر بھی زخم سے خون نکلنا بند نہ ہوا۔

بادشاہ خون سے تر پٹی اُتارتا اور اسے اچھی طرح دھو کر پھر اس کے زخم پر باندھ دیتا۔ اس عمل کو دہرانے سے خون نکلنا بند ہو گیا۔

خون کے بند ہونے پر اس شخص کو ہوش آئی اور اس نے اشارے سے کچھ پینے کے لیے مانگا۔

اس پر بادشاہ دوڑا ہوا گیا اور کنویں سے تازہ پانی لا کر اسے دیدیا۔

اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ چنانچہ بادشاہ اور درویش اس شخص کو اٹھا کر جھونپڑی میں لے آئے۔ اور اسے بستر پر لٹا دیا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ شخص سو گیا بادشاہ دن بھر کی تھکاوٹ سے چور ہو کر دہلیز پر سستانے کیلئے بیٹھا۔ کہ وہیں سو گیا۔

جب صبح خواب سے بیدار ہوا۔ تو زخمی کو اپنی طرف غور سے گھورتے ہوئے دیکھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے"، زخمی نے بادشاہ سے کہا جو اب پوری طرح بیدار ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "میں تمہیں نہیں جانتا"۔

"پھر یہ معافی کی درخواست کیسی؟"، بادشاہ نے زخمی سے دریافت کیا۔ "آپ مجھے نہیں پہچانتے مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ——— میں آپ کا دشمن ہوں ——— وہ دشمن جس کے بھائی قتل کروا کر آپ نے اس کی جائداد پر قبضہ کر لیا تھا ——— وہ دشمن جس نے اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کی قسم لے رکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ درویش کو ملنے کے لیے باہر آئیں گے۔ اس لیے میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آپ کو واپسی پر قتل کر دوں۔ چنانچہ آپ کی تلاش میں اپنی جائے پناہ سے نکلا۔ مگر آپ کے محافظوں کے ساتھ دو چار ہونا پڑا۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اور مجروح کر دیا کسی نہ کسی طرح میں ان کی گرفت سے بچ نکلا۔ ان کے ہاتھوں مرتے مرتے بچ گیا۔ مگر میری حالت بہت نازک تھی۔ زخم سے فواروں خون نکل رہا تھا۔ اگر آپ میرے حال پر رحم کر کے مرہم پٹی نہ کرتے۔ تو موت یقینی تھی۔ میں آپ کی موت کا خواہاں تھا۔ مگر آپ نے میری جان بچائی اب اگر میں زندہ رہا تو تمام عمر ایک وفادار غلام کی طرح آپ کی خدمت بجا لاؤں گا اور اپنے

بیٹوں کو بلتییں کرونگا .... کیا آپ مجھے معاف نہ فرمائینگے؟!

اس آسانی سے ایک جانی دشمن کو دوستی کا ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس لیے اس نے نہ صرف اسے معاف کر دیا۔ بلکہ وعدہ کیا۔ کہ وہ اس کے علاج کیلئے شاہی حکیم اور شاہی نوکر مقرر کر دے گا۔ اور اس کی کھوئی ہوئی جائداد بھی واپس کر دیگا۔

زخمی سے رخصت لیکر بادشاہ جھونپڑی سے باہر آیا۔ اور درویش کی تلاش شروع کی جھونپڑی کو خیر باد کہنے سے پیشتر وہ آخری بار درویش کی خدمت میں ان سوالوں کے جواب کیلئے درخواست کرنا چاہتا تھا۔

درویش کیاریوں کے پاس ہی گھٹنوں کے بل بیج بو رہا تھا۔ بادشاہ اس کے پاس گیا اور کہنے لگا "عقلمند درویش! میں تیری خدمت میں پھر حاضر ہوا ہوں۔ کہ تو میرے سوالوں کا جواب دے"

"تمہارے سوالوں کا جواب تو مل گیا ..... اب کیا چاہتے ہو"؟

درویش نے بادشاہ کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ کس طرح؟ .... آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟"

"سنو ..... اگر تم کل میری کمزوری کا خیال کرتے ہوئے کیاریاں کھودنے کے لیے نہیں ٹھہرتے۔ اور اس کی بجائے واپس چلے جاتے تو تمہارا دشمن تم پر ضرور حملہ آور ہوتا۔ چنانچہ وہ وقت ہی تمہارے لیے موزوں تھا جب تم زمین کھودتے

میں مصروف تھے۔ میری ذات ہی اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اور تمہاری ہمدردی کا اظہار ہی سب سے زیادہ ضروری اور اہم کام تھا۔

اس کے بعد جب زخمی شخص ہماری طرف آ رہا تھا۔ تو تمہارے لیے کسی اچھے کام کرنے کیلئے وہی وقت موزوں تھا۔ جب تم اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ کیونکہ اگر تم اس کی اچھی طرح نگہداشت نہ کرتے تو تمہارا ایک جانی دشمن تمہارے ساتھ صلح کئے بغیر اس جہان سے رخصت ہو جاتا پس وہ شخص ہی اس وقت سب سے زیادہ ضروری اہم کام تھا ۔ ۔ ۔ اس لیے یاد رکھو کہ کسی خاص کام کے لیے صرف ایک ہی وقت موزوں ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ہم میں اتنی قوت ہے کہ ہم اسے سرانجام دے سکیں۔ سب سے زیادہ ضروری شخص وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ تم اس وقت موجود ہو۔ کیونکہ اس بات کا معلوم کرنا کہ اس شخص کے سوا تمہیں کسی اور شخص سے بھی واسطہ پڑے گا۔ انسان کے فہم و قیاس سے بالا ہے اور سب سے ضروری اور اہم کام اس شخص کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔

کیونکہ خدا نے انسان کو صرف اسی غرض کیلئے دنیا میں بھیجا ہے

۱۔ خادمہ

"چیخوف"

۲۔ ایثار

خادمہ

رات ـــــــــ

سیزدہ سال آیا "وارکا"، جھولے کو آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے۔ جس میں ننھا سا بچہ لیٹا ہوا ہے اور دبی زبان میں لوری گنگنا رہی ہے۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ ـــــ میں تمہیں لوری دے رہی ہوں۔"

جھولے کے سامنے ایک سبز رنگ کا لیمپ جل رہا ہے۔ کمرے میں ایک رسی پر سیاہ پتلون اور ننھے کے کپڑے لٹک رہے ہیں جن کے لمبے لمبے سائے وارکا اور بچے کے جھولے پر پڑ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیمپ کی بتی کے شعلے کے ساتھ سائے بھی رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے تیز ہوا میں پتیاں کانپ رہی ہوں۔

کمرے میں سخت حبس ہو رہا تھا۔ اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے گوبھی کا بدبودار شوربہ پاس ہی رکھا ہو۔ یا یہ جگہ کسی بوٹ بنانے والے کی دوکان ہو۔

بچہ چلا رہا ہے۔ گو اسے چلاتے چلاتے یہ وقت آگیا ہے اور وہ اس بے چیخ پکار سے تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی روئے جا رہا ہے اور یہ معلوم نہیں کہ کب چپ ہو۔

بیچاری وارکا کو نیند آرہی ہے۔ نیند کے غلبہ سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں سر آگے کو جھکا جا رہا ہے گردن میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں کہ لبوں یا آنکھوں کو ہلا سکے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اِس کا ۔ کاٹھ سر تک

پر چوب سے تراشا ہوا ہے۔ اور گھس گھس کر سوئی کے سرے کے برابر رہ گیا ہے۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ برابر گنگنا رہی ہے جھینگر درد ناک راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔ ملحقہ کمرے سے آقا اور اس کے شاگرد افانسی کے خراٹوں کی آواز آرہی ہے۔

بچے کا جھولا غمناک آواز پیدا کر رہا ہے۔ یہ تمام آوازیں مل کر ایک تسکین بخش راگ پیدا کر رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان اشخاص کے لیے جو بستر میں آرام سے لیٹے ہوں۔ مگر اس وقت یہ راگ تکلیف دہ اور گراں بار معلوم ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اس کی موجودگی میں وارکا کا سو جانا یقینی ہے۔

اور اگر وارکا خدا نہ کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا نہ کرے سو جائے تو اس کا آقا اور ملکہ اسے خوب مار پیٹ کرے۔

لیمپ کی بتی کلملانے لگتی ہے۔ سبز روشنی کے دھبے اور لانبے لانبے سائے حرکت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جو وارکا کی نیم وا خواب آلود آنکھوں اور تھکے ہوئے دماغ کے سامنے دھند میں لپٹی ہوئی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔

اب اس کی نظروں میں یہ دھندلی تصویریں سیاہ بادلوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جو آسمان میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوں۔

یکایک ہوا چلتی ہے جو بادلوں کو منتشر کر دیتی ہے۔ اب وارکا پتلے کیچڑ سے بھری ہوئی ایک وسیع سڑک کو دیکھتی ہے جس کے دائیں بائیں چھکڑے قطار در قطار

کھڑے ہیں اور درمیان میں لوگ کندھوں پر تھیلے اُٹھائے تکان سے چور چل رہے ہیں ـــــ
دفعتاً یہ لوگ مع اپنے تھیلوں کے کیچڑ میں گر پڑتے ہیں۔

"تم کیوں گرے ہو؟" وارکا ان سے سوال کرتی ہے۔

وہ جواب دیتے ہیں "سونے کے لیے"۔

یہ کہہ کر وہ گہری اور میٹھی نیند سو جاتے ہیں۔ جبکہ کوّے اور نیل کنٹھ بجلی کی تاروں پر بیٹھے ان کو جگانے کیلئے بچوں کی طرح چیخ رہے ہوتے ہیں۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ ......" وارکا گنگناتی اور اپنے آپ کو تنگ و تاریک جھونپڑی میں پاتی ہے۔ جہاں اس کا مرحوم باپ درد کی وجہ سے زمین پر لیٹ رہا ہے۔ درد کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ منہ سے سوائے اُف ـــ اُف ـــ اُف اور کچھ نہیں بول سکتا۔

اس کی ماں پیلاگیویا گھر میں موجود نہیں کیونکہ وہ آقا کو خبر دینے گئی ہوئی ہے کہ یافیم مر رہا ہے۔ اس کو گئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے حالانکہ اس وقت تک اسے واپس آجانا چاہیئے تھا۔ وارکا انگیٹھی کے قریب خاموش بیٹھی ہوئی اپنی والد کو کراہتا سن رہی ہے۔ دفعتاً وہ جھونپڑی کے باہر کسی گاڑی کی آواز سنتی ہے ـــ اتنے میں ایک جوان ڈاکٹر اندر داخل ہوتا ہے جس کا چہرہ تاریکی کی وجہ سے بخوبی نظر نہیں آتا ـــ وارکا اسے اتنا کہتا ہوا سنتی ہے۔ "

"روشنی کرو"

جواب میں یافین اُف اُف کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔

بلیوگیو یا دیا سلائی ڈھونڈنے کی خاطر انگیٹھی کی طرف دوڑتی ــــ ایک منٹ مکمل خاموشی میں گزر جاتا ہے۔ اِس کے بعد ڈاکٹر اپنی جیب سے دیا سلائی نکال کر روشن کرتا ہے۔ ــــ جناب ذرا اسے روشن ہی رکھیے ــــ میں ابھی آئی یہ کہتی ہوئی بلیوگیو یا جھونپڑی کے باہر دوڑ کر موم بتی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لاتی ہے یافین کے رخسار سرخ ہو رہے ہیں اور اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی ہیں جیسے وہ جھونپڑی اور ڈاکٹر کو چیرتی ہوئی کسی موہوم چیز کا مطالعہ کر رہی ہوں۔

"میاں کیا سوچ رہے ہو؟ ــــ کب سے یہ تکلیف ہے تمہیں" ڈاکٹر اس کی طرف جھکتے ہوئے کہتا ہے۔"

"جناب! مر رہا ہوں ــــ میرا وقت قریب آگیا حضور اب ــــ تھوڑے عرصے کے بعد میں اِس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔" "بیہودہ باتیں مت کرو ہم تمہیں صحت یاب کر دیں گے۔"

"اِس عنایت کیلئے ہم غریب شکر گزار ہیں جناب ــــ معلوم ہوتا ہے ــــ جب موت آتی ہے تو پھر اس سے بچنا؟؟"

ڈاکٹر یافین نصف گھنٹہ معائنہ کرنے کے بعد کہتا ہے۔ "معاملہ میری حد سے باہر ہے تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم کسی ہسپتال چلے جاؤ۔ وہیں پر تمہارا علاج ہو سکتا ہے ــــ بس جلدی جاؤ ــــ بہت دیر ہو چکی ہے اور ہسپتال والے

ہے ہونگے ـــــ مگر اس کی کوئی پرواہ نہیں میں تمہیں ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں سنتے

یا نہیں ؟،،

مہربان جناب! وہ اتنی دور پیدل کس طرح جائے ـــــ ہمارے پاس کوئی

را نہیں،،۔ پلیوگیویا نوجوان ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے۔

فکر مت کرو میں تمہارے آقا سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں گھوڑا مہیا کر دیگا ڈاکٹر

صت ہو جاتا ہے ـــــ موم بتی بھی رخصت ہو جاتی ہے اب پھر وہی اُف اُف،،

واز شروع ہو جاتی ہیں۔

کوئی لفف گھنٹہ کے قریب جھونپڑی کے باہر کوئی گاڑی ٹھہرتی ہے ـــــ یہ

ں چھکڑا تھا جو یافتن تیار ہو کر چلا جاتا ہے۔ اب دن چڑھ آیا ہے پلیوگیویا گھر پر

ں کیونکہ وہ یافتن کی خبر لینے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہی ـــــ کسی جگہ بچے

چلانے کی آواز آرہی ہے اور وارکا کسی کو اپنی آواز میں ہی گنگناتا ہوا سنتی ہے

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ ـــــ،،

اتنے میں پلیوگیویا واپس آتی ہے اور اپنی چھاتی پر صلیب کا نشان بناتے

ئے دبی زبان میں کہتی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے رات کیلئے تو اچھا کر دیا مگر

کے وقت اس نے اپنی روح خدا کے حوالے کر دی۔ خدا اس کی روح

ین بخشے ـــــ وہ کہتے ہیں کہ اسے بہت دیر بعد ہسپتال لایا گیا۔ اس لئے

ہیے تھا۔ کر وہ پہلے ہی وہاں چلا جاتا ؛؛

وار کا یہ سنتے ہی دیوانہ وار سڑک چلانا شروع کر دیتی ہے۔ مگر دفعتاً گا
شخص اس کے سر پر ایسی ضرب لگاتا ہے کہ اس کی پیشانی ایک درخت کے
سے ٹکراتی ہے ــــــ آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے تو سامنے اسے اپنا آقا
ــــــ یعنی پالوش ساز نظر آتا ہے

"نابکار ــــــ بچہ چلا رہا ہے اور تم گہری نیند سو رہی ہو" پالوش ساز
کو سر پر پتھر مارتا ہوا کہتا ہے"

وارکا گہوارہ کو جنبش دے کر جھولا ہلانا اور لوری دینا شروع کر دیتی ہے۔
کمرے میں روشنی کے دھبے اور کپڑوں کے سائے کانپتے ہیں اور وارکا کی
دیکھتے ہوئے سر ہلاتے معلوم ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سب چیزیں پھر وارکا کے
دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اب پھر وہ کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک دیکھتی ہے جس میں
والے شخص گہری نیند سو رہے ہیں انہیں سوتے دیکھ کر وارکا کے دل میں بھی خوا
پیدا ہوتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سو جائے مگر اس کی ماں پلیو گیویا اس
کے ساتھ ہے۔ جو اسے آگے دھکیل رہی ہے ــــــ وہ دونوں نوکری
ڈھونڈنے کی خاطر شہر کی جانب بڑھ رہی ہے۔

"خدارا ہمیں کچھ بھیک دیجیے ــــــ خدارا ہم پر رحم فرمائیے"۔ اس
ماں راہ گزروں سے مانگتی ہے۔

"بچے کو یہاں بھیج دو"، ایک مانوس آواز جواب دیتی ہے۔

ہی آواز دوبارہ پکارتی ہے۔ "بچے کو یہاں بھیجدو ـــــ کیا سن رہی ہو بدقسمت
"، یہ سنتے ہی وارکا اچھل پڑتی ہے۔ اور اپنے اردگرد دیکھتی ہے کہ معلوم کرے
یا ہے۔ اب نہ وہ بڑی سڑک ہے۔ اور نہ اس کی ماں پلیو گیویا۔ اور نہ ہی وہ شخص
بھیک مانگ رہی تھی۔ اگر وہ اس وقت کمرہ میں موجود ہے تو اس کی مالکہ جو
کو دودھ پلانے کے آئی ہوئی ہے۔

وارکا کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ کہ وہ مالکہ کے دودھ پلانے کے بعد بچہ کو
لے کھڑکیوں سے باہر دھندلی سی روشنی نظر آرہی ہے کمرے میں کپڑوں کے
اور روشنی کے دھبے آہستہ آہستہ زرد ہو رہے ہیں ـــــ تھوڑی دیر بعد سورج
ہوگا۔

اسے لے جاؤ ـــــ عرصہ سے چلا رہا ہے معلوم ہوتا اس پہ جادو کیا گیا ہے"
اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہتی ہے۔

وارکا بچہ کو لے کر جھولے میں لٹا دیتی ہے۔ اور اسے ہلانا شروع کر دیتی ہے۔
شنی کے دھبے اور سائے قریباً قریباً غائب ہو چکے ہیں اب کمرہ میں کوئی ایسی چیز موجود
ی جو اس کے دماغ اور آنکھوں پر اثر پذیر ہو سکے مگر وہ پھر بھی پہلے کی طرح سونا چاہتی ہے
وارکا اپنا سر جھولے کے کنارے رکھ کر کوشش کرتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح نیند
لے لے۔ مگر بے سود اس کی آنکھیں بلی جا رہی ہیں اور سر بدستور بھاری ہو رہا ہے۔
"وارکا انگیٹھی میں کوئلے ڈالو"، وہ دروازے سے اپنے آقا کی آواز سنتی ہے۔

چنانچہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ وارکا اٹھ کر گھر کا کام کاج شروع کر دے۔ چھوٹے کو چھوڑ کر کوئلہ لانے کیلئے بھاگی ہوئی گودام میں جاتی ہے ــــ وہ اب خوش ہے ــــ اس لیے کہ جب بدن حرکت میں ہو۔ تو نیند بہت کم ستاتی ہے۔

کوئلہ لا کر وہ انگیٹھی گرم کرتی ہے۔ اب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا چوبی چہرہ پھر زندگی اختیار کر رہا ہے۔ اور خیالات آہستہ آہستہ صاف ہو رہے ہیں

"وارکا سماوار گرم کرو"، اس کی مالکہ چلاتی ہے۔

اس پر وارکا لکڑی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹتی ہے۔ اور ابھی انہیں جلانے نہیں پائی ہوتی کہ ایک تازہ حکم سنتی ہے۔

"وارکا اپنے آقا کے بڑے بوٹ صاف کرو"!

وہ بڑے بوٹوں کو لے کر فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سوچتی ہے کہ کیا اچھا ہو۔ اگر وہ اس بڑے بوٹ میں سر ڈال کر تھوڑا سا آرام کرے ــــ یک لخت وہ بوٹ بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ اور سارے کمرہ میں پھیل جاتا ہے۔ وارکا کے ہاتھ سے برش گر پڑتا ہے۔ مگر وہ اسی وقت سر کو جنبش دے کر آنکھیں کھول دیتی ہے اور اپنے گرد و نواح کی چیزوں کو اس انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ بڑی ہو کر آنکھوں کے سامنے حرکت نہ کریں۔

"وارکا! سیڑھیوں کو دھو ڈالو ــــ اتنی میلی سیڑھیاں دیکھ کر گاہک کیا خیال کریں گے۔ مجھے تو شرم محسوس ہوتی ہے"!

وارکا سیڑھیوں کے دھونے کے علاوہ کمروں کو بھی صاف کرتی ہے۔ اور پھر دوسرے سماوار کو گرم کرنے کے بعد دکان کی طرف بھاگی جاتی ہے۔ اسے وہاں بہت کام کرنے ہیں۔ اس لیے وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتی۔

اس سے بڑھ کر کوئی اور تکلیف دہ کام نہیں ہو سکتا۔ کہ باورچی خانہ میں میز کے قریب بیٹھ کر آلو تراشے جائیں۔ وارکا کا سر میز پر جھکا جا رہا ہے۔ آلو اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتے نظر آتے ہیں چاقو اس کے ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔ اور اس کے کانوں میں مالکہ کی آواز گونج رہی ہوتی ہے۔ جو اس کے قریب قمیض کو کہنیوں تک چڑھائے بلند آواز میں باتیں کر رہی ہوتی ہے۔

سارا دن کپڑے دھونے، برتن صاف کرنے کھانا چننے اور سینے پرونے میں بسر کرنا بھی آلو تراشنے کی طرح تکلیف دہ ہے۔ —— کبھی کبھی ان کاموں سے تنگ آکر وارکا اتنی بیتاب ہو جاتی کہ ننگے فرش پر سو جائے۔

دن گزر جاتا ہے —— کھڑکیوں کو تاریک ہوتے دیکھ کر وارکا کنپٹیوں کو زور سے دباتی ہے۔ جو خشک چوب سے تراشی ہوئی محسوس ہوتی ہیں —— سنتی ہے گو اسے خود معلوم نہیں کیوں؟

شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی اس کی نیم وا آنکھوں کیلئے وعدۂ خواب لے کر آتی ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد مہمان آجاتے ہیں۔

"وارکا سماوار گرم کردے،" اس کی مالکہ بلند آواز میں حکم دیتی ہے۔

چونکہ سماوار چھوٹا ہے اس لئے اسے تمام مہمانوں کو چائے پلانے کیلئے اسے پانچ چھ مرتبہ گرم کرنا پڑتا ہے۔ چائے تقسیم کرنے کے بعد وار کا دوسرے احکام کی منتظر ایک گھنٹہ تک وہاں کھڑی رہتی ہے۔

"وار کا بھاگ کر تین بوتلیں بیئر کی خرید لاؤ"،

وار کا اس خیال سے کہ تیز دوڑنے سے نیند کا غلبہ دور ہوجائے گا بیئر خریدنے کیلئے بھاگی ہوئی جاتی ہے۔

"وار کا تھوڑی سی ووڈکا لاؤ ـــــــ وار کا بوتل کھولنے کا اوزار لاؤ ـــــــ وار کا اس گلاس کو صاف کرو!"،

آخر مہمان رخصت ہوجاتے ہیں۔ کمرے کی روشنی گل کر دی جاتی ہے اور آقا و مالکہ دونوں سونے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ "بچّہ کا جھولا ہلاتی رہو" وار کا آخری حکم سنتی ہے۔ انگیٹھی میں جھینگر دردناک راگ الاپتے ہیں روشنی کے دھبے اور کپڑوں کے سائے کا رقص وار کا کی آنکھوں پر پھر قابض ہو کر اس کے دماغ کو دھندلا بنا دیتا ہے

سو جاؤ میرے ننھے سو جاؤ ...... وہ گنگنانا شروع کر دیتی ہے۔

بچہ چلاتا ہے۔ اور چلاتے چلاتے تھک جاتا ہے ـــــــ اب وار کا وہی کیچڑ سے لت پت سڑک، تھیلوں والے مزدور اپنی ماں پلیو گیویا اور باپ کو دیکھتی ہے ـــــــ وہ ان دھندلی تصویروں کو اچھی طرح سمجھتی ہے سب کو پہچانتی ہے۔ مگر نیم خواب کی حالت میں وہ اس طاقت کو جس نے اس کے ہاتھ

پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ جو اس کی چھاتی پر بوجھ ڈال رہا ہے اور اسے زندہ رہنے دیتا، نہیں بچ سکتی۔ اِس طاقت کی جستجو کیلئے وہ اپنے اردگرد نظر دوڑاتی ہے۔ تاکہ اس کے پنجوں سے بھاگ نکلے مگر بے سود۔ آخر کار اس تلاش سے تنگ آ کر وہ اُس وقت اس کو ڈھونڈنے کیلئے آخری کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتی ہے۔

روشنی کے رقصاں دھبوں اور کپڑوں کے متحرک سائے پر نظر دوڑانے کے بعد وہ اس دشمن کو پالیتی ہے۔ جو اس کی زندگی میں سدِّ راہ ہو رہا ہے۔

وہ دشمن بچہ تھا۔

وہ ہنستی ہے اس خیال سے کہ ایسے آسان معمہ کا حل وہ اِس سے پہلے نہ کر سکی روشنی کے دھبے کپڑوں کے سائے اور جھنگر بھی مسکراتے اور متحیر معلوم ہوتے ہیں یہ خیال وارکا کے دماغ پر بُری طرح مسلط ہو جاتا ہے۔ چوکی سے اٹھ کر مسکراتی ہوئی بغیر جھپکنے والی آنکھوں سے کسی موہوم چیز کو دیکھتی ہوئی وہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتی ہے — وہ خوش ہے اور یہ خیال اس کی خوشی کو دوبالا کر رہا ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد وہ جس نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں موجود نہ ہوگا بچے کی موت کے بعد نیند ...... نیند ...... نیند۔

روشنی کے دھبوں کو دیکھ کر ہنستی، آنکھیں جھپکاتی اور انگلیوں کو حرکت دیتی ہوئی وارکا بچے کے جھولے کی طرف بڑھتی ہے۔ بچے کو ہلاک کرکے وہ فوراً زمین پر لیٹ جاتی ہے — خوشی کی وجہ سے ہنستی ہے کہ وہ اب آرام سے سو سکیگی — تھوڑی دیر کے بعد وہ سو جاتی ہے — موت کی گہری نیند۔

ایثار

میں ٹنسکار کھیلنے کے بعد گھر کے باغ کی روش پر سے گزر رہا تھا میرا وفادار کتا مجھ سے چند گزوں کے فاصلہ پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

یک لخت اِس کی رفتار مدہم پڑ گئی۔ اگلے پنجوں کو اس طرح اٹھانے لگا گویا کسی شکار کو سونگھ رہا ہے۔

جب میں نے روش پر نظر دوڑائی۔ تو مجھے قریب ہی زمین پر چڑیا کا ایک بچہ دکھائی دیا۔ جس کی چونچ زرد تھی۔ اور بدن پر نرم نرم روئیں اُگ رہے تھے۔ یہ غالباً اپنے گھونسلے سے گر پڑا تھا۔ کیونکہ آج ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ اور روش کے آس پاس لگے ہوئے درخت زور زور سے ہل رہے تھے۔

معصوم بچہ چپ چاپ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اڑنے کیلئے ننھے ننھے پر پھیلاتا مگر اتنی طاقت نہ تھی کہ پرواز کر سکے ـــــ بیچارہ پھڑ پھڑا کر رہ جاتا۔

میرا کتا اس کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ کہ دفعتاً قریب کے درخت سے ایک چڑیا اتری اور کتے اور بچے کے درمیان زمین پر اس طرح آ پڑی جیسے پتھر گر پڑا ہو۔

کتے کے کھلے ہوئے جبڑوں کی طرف دیکھ کر ایک دردناک اور رحم طلب آواز میں چلائی اور اس کی طرف جھپٹ پڑی ـــــ وہ اپنے ننھے بچے کو میرے کتے سے بچانا چاہتی تھی۔ اسی غرض کیلئے اس نے اسے اپنے بدن سے ڈھانپ لیا اور چیخ و پکار شروع کر دی۔ اس کے چھوٹے گلے میں آواز گھٹنے لگی ـــــ تھوڑی دیر کے بعد بے جان

ہو کر گری اور مر گئی ـــــ اور اس طرح اپنے آپ کو قربان کر دیا۔
وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچے کو کتے کا لقمہ بنتے نہیں دیکھ سکتی
اس کی نظروں میں میرا کتا غالباً ایک ہیبتناک دیو کی مانند تھا۔
وہ کیا شے تھی جو چڑیا کو شاخ صنوبر سے کشاں کشاں زمین پر لائی
میرا کتا حساس تھا۔ چڑیا کو اس طرح قربان ہوتے دیکھ کر ٹھٹکا اور ایک
ہٹ گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف اشارہ سے بلا لیا اور آگے بڑھ گئے۔
یہ واقعہ دیکھ کر مجھے تسکین سی معلوم ہوئی۔ روح سے ایک بوجھ ہٹ
نظر آیا۔ اُس بہادر چڑیا کی غیر معمولی جرأت نے میرے دل میں احترام اور
فرض کے جذبات موجزن کر دیئے۔
میں نے خیال کیا کہ محبت۔ موت اور اس کی ہیبت سے کہیں زیادہ ہے او
محبت ہی ایسی چیز ہے۔ جو زندگی کے نظام کو قائم اور متحرک رکھتی ہے

مزدور کی شکست

(گورکی)

مزدور کی شکست

ہم تعداد میں چھبیس تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھبیس متحرک مشینیں ایک مکان میں مقید۔ جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک بسکٹوں کیلئے میدہ تیار کرتے ۔

ہماری زندان نما کوٹھڑی کی کھڑکیاں اینٹوں اور کوڑا کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کی طرف کھلتیں ۔ جنکا نصف حصہ آہنی چادر سے ڈھکا ہوا اور شیشے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے ۔ اسلیے سورج کی شعائیں ہم تک نہ پہنچ سکتیں ۔

ہمارے آقا نے کھڑکی کا نصف حصہ بند کروا دیا کہ ہمارے ہاتھ اِس کی روٹی میں سے ایک لقمہ بھی غریبوں کو دینے کیلئے باہر نہ نکل سکیں یا ہم اِن بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں ، جو کام کی قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے ۔

ہمارا مالک ،، جیل ،، کے علاوہ کھانے کے لئے بیکار سا اور کھانے کے لئے گوشت کی بجائے انتڑیاں دیتا۔

اِس سنگین زندان کی چھت تلے جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑیوں کے جالے سے بھری پڑی تھی ۔ ہم نہایت تکلیف میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔

اِس چار دیواری میں جو کیچڑ اور میدہ کے خمیر سے اٹی ہوئی تھی ہماری زندگی ـــــ غم و فکر کی زندگی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پوری نیند اور آرام کے بغیر ہم ہر روز صبح پانچ بجے بیدار ہو کر نیم خوابی کی حالت میں ہی اِس میدہ سے بسکٹ تیار کرنے لگ جاتے جو ہمارے سوتے وقت تیار کیا ہوتا ۔

اس طرح صبح سے لیکر رات کے دس بجے تک ہم میں سے کچھ تو بسکٹوں کے لیے خمیر تیار کرتے اور کچھ میدہ گوندتے۔ اتنا عرصہ ہی ابلتے ہوئے پانی کی آواز بھی نانبائی کی سلاخ ڈالنے کا شور ہمارے کانوں میں گونجتا رہتا۔

صبح سے لیکر شام تک بھٹی آتشکدہ کی طرح دہکتی رہتی۔ جس کی سرخ شعاؤں کا عکس دیوار پر اس طرح رقص کرتا معلوم ہوتا جیسے وہ ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش ہنسی ہنس رہا ہو۔

وہ بھٹی بھی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی جو اپنے بڑے حلق سے آگ اگل رہا ہو۔ ہمارے سامنے جہنم کی جھلسا دینے والی گرمی ایسے سانس لے رہا ہو اور ہماری غیر مختتم کام کو اپنی پیشانی کے سیاہ و تاریک سوراخوں سے مطالعہ کر رہا ہو۔ یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے ــــــ آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی اور رحمدلی کے جذبہ سے عاری ہوں۔ یہ آنکھیں ہمیشہ تاریک نظر سے دیکھتیں۔ جیسے وہ اپنے غلاموں کو دیکھتے دیکھتے تنگ آگئی ہوں اور اس بات کی توقع چھوڑ دی ہو۔ کہ جنس آدم ہی سے ہیں۔

ہم روز ناقابل برداشت گرد و غبار اور جھلسا دینے والی بھاپ کے درمیان اپنی عرق آلود پیشانیوں سے میدہ گوندھتے اور بسکٹ تیار کرتے۔ ہمیں اس کام سے سخت نفرت تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہم تیار کردہ بسکٹوں پر سیاہ اور ریگ آلود روٹی کو ترجیح دیتے تھے۔ روزمرہ کے کام سے ہمارے اعصاب مشینوں کی طرح خود بخود کام کرتے گئے

عادی ہو گئے تھے اور لبا اوقات انکی حرکت دل و دماغ سے محو ہو جاتی تھی۔

کام کے دوران ہم ایک دوسرے سے بالکل ہمکلام نہ ہوتے کیونکہ ہمارے پاس گفتگو کیلئے کوئی موضوع ہی نہ تھا۔ اس لیے ہمارا تمام وقت خاموشی میں گزرتا بشرطیکہ ہم میں سے کوئی کسی سے لڑ نہ پڑے مگر جھگڑے کا بہت کم موقع آتا ——— اور آتا بھی کیسے؟ ——— جبکہ انسان نیم مردہ ہو ——— ایک بت جس کی حسیات شب روز کی متواتر محنت سے کند اور مردہ کر دی گئی ہوں۔ خاموشی ان اشخاص کے لیے جو سب کچھ کہہ چکے ہوں۔ اور کچھ کہنے کیلئے باقی نہ رکھتے ہوں۔ خوف اور اذیت ہے مگر ان کے لیے جو ابھی تک اپنی آواز سے نا آشنا ہوں۔ خاموشی بجائے تکلیف دہ ہونے کے آسان و راحت رساں ہے۔

اس خاموشی کو کبھی کبھار ہمارا راگ توڑ دیتا ——— وہ راگ اسطرح ظہور میں آتا ——— ہم میں سے ایک کبھی تھکے ہوئے گھوڑے کے ہنہنانے کی طرح کوئی ایسا راگ الاپنا شروع کر دیتا۔ جو عموماً ایسے موقعوں پر روح کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مدد دیتا ہے پہلے پہل تو اس اداس راگ میں کوئی شامل نہ ہوتا ——— اور وہ راگ ہماری زنداں نما کوٹھڑی کی چھت کے نیچے شمع کی لو کی طرح لرزتا رہتا مگر تھوڑی دیر کے بعد اس گانے والے کے ساتھ ہم میں سے ایک اور شامل ہو جاتا ——— اب وہ غمگین و ہم آہنگ آوازیں ہماری قبر نما کوٹھڑی کی کثیف فضا میں تیرتی نظر آتی تھوڑی دیر کے بعد ہم سب اس راگ میں شامل ہو جاتے۔ ———

اب بہت سی آوازیں جمع ہو کر سمندر کی موجوں کی طرح سنگین قفس کی سیاہ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر گونجنا شروع کر دیتیں۔ اس طرح ہم سب اپنے آپ کو راگ الاپنے میں مصروف پاتے۔

ہمارے بلند راگ کے سُر جو کوٹھڑی میں آزادانہ طور پر سما نہ سکتے تھے پتھر کی سیاہ دیواروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری نالہ فریاد کرتے۔ اور ہمارے بے حس دلوں میں ایک ہیجان .... ایک میٹھا سا درد پیدا کر دیتے جو اس کے مندمل زخموں کو پھر ہرا کر دیتا ہے اور اسے ایک نئے الم کے لیے بیدار کر دیتا ہے عام طور پر گانے والا سرد آہ بھرتے ہوئے اپنا گانا بند کر دیتا اور آنکھیں بند کیے اپنے رفیقوں کے راگ کو خاموشی سے سنتا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔

اس کی نگاہوں میں راگ کی بڑھتی ہوئی ہر ایک دُور افتادہ سڑک تھی——— دور بہت دور ...... ایک کشادہ سڑک سورج کی جاں پرور روشنی سے منور جس پر وہ گامزن ہے.........

اسی دوران میں آگ کے شعلے بھٹی میں سرخ زبانیں نکال رہے ہوتے نانبائی کی آہنی سلاخ بھٹی کی زرد اینٹوں پر تیز آواز میں کھیل رہی ہوتی۔ ابلتے ہوئے پانی کا شور بدستور جاری رہتا اور شعلوں کا عکس دیوار پر رقصاں خاموش ہنسی ہنس رہا ہوتا۔

اور ہم کسی غیر کے لفظوں میں اُن انسانوں کا دکھ درد بیان کرنے میں معروف ہوتے

جن سے سورج کی روشنی چھین لی گئی ہو ۔ جو غلام ہوں ۔

یہ بھی ہماری زندگی ——— جیسے غلاموں کی زندگی اس قفس میں جس میں زندگی

کے ایام اِسقدر تلخ گذر رہے تھے ۔ کہ معلوم ہو رہا تھا کہ سنگین مکان کی تینوں منزلیں

ہمارے کندھوں پر تعمیر کی گئی ہیں ۔

گانے کے علاوہ ہمارے پاس ایک اور شغل تھا جس کی ہماری نظروں میں ویسے ہی

قدر و قیمت تھی ۔ جیسے سورج کی دلفریب شعاؤں کی ۔

ہمارے مکان کی دوسری منزل میں زری کا کارخانہ تھا ۔ جس میں بہت لڑکیاں

ملازم تھیں ۔ اِن لڑکیوں میں سولہ برس کی دوشیزہ ٹھنیا نامی تھی جو ہمارے سامنے

والی دیوار کی چھوٹی کھڑکی کے پاس ہر روز آتی اور سلاخوں کے ساتھ اپنا گلاب جیسا

چہرہ لگا کر سریلی آواز میں پکارتی ۔

"مظلوم قیدیو ! مجھے تھوڑے سے بسکٹ دو "

اس آواز کو سنتے ہی ہم سب کھڑکی کے پاس دوڑے چلے جاتے ۔ اور اس خوبصورت

اور معصوم چہرہ کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ۔ اس کی آمد ہمارے لیے خوشگوار ہوتی ۔

اسے کھڑکی کے پاس دیکھ کر ہم سب دروازہ کی جانب بڑھتے اور ایک دوسرے

کو ریلتے ہوئے دروازہ کھول دیتے ۔ دروازہ کھولنے پر وہ اندر آجاتی ۔

ہمیشہ ایک ہی انداز کے ساتھ مسکراتی ہوئی اپنے خوبصورت سر کو ایک طرف

لٹکائے ہوئے جس سے بھورے بالوں کے خوبصورت گیسو عجیب دلکش انداز میں اس کے شانوں پر لٹک رہے ہوتے۔

ہم غلیظ، زشت رو اور بدوضع حسرت زدہ بھکاریوں کی طرح کھڑے اس کی شکل کی طرف دیکھا کرتے۔ جو دروازے کی دہلیز پر کھڑی محو تبسم ہوتی۔ ہم سب اس کی خدمت میں صبح کا سلام عرض کرتے۔ اور اس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت خاص الفاظ استعمال میں لاتے۔

وہ الفاظ ہماری زبان سے خاص اسی کے لیے نکلتے ____ خاص اسی کیلئے۔ جب ہم اس سے ہمکلام ہوتے۔ تو ہماری آواز خلاف معمول ملائم اور نرم ہوتی۔ اور ہماری بدزوقی اسی وقت بالکل غائب ہوجاتی ____ یہ آداب صرف اُسی کیلئے مخصوص تھے۔ نانبائی بالکل سرخ اور خستہ بسکٹ نکال کر اس کی جھولی میں عجب چابک دستی سے پھینک دیا کرتا۔

دیکھو! خیال رہے کہیں آفل کے دام میں گرفتار نہ ہوجانا،، ہم ہمیشہ اُسے اس خطرہ سے آگاہ کرتے رہتے۔

اس پر وہ دلکش ہنسی ہنستی ہوئی یہ جواب دیتی ،،خدا حافظ میرے ننھے قیدیو،، ____ اور یہ کہتے ہی وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوجایا کرتی۔ اس کی روانگی کے بعد ہم دیر تک اس کے متعلق گفتگو کرتے ____ ہمارے خیالات ہمیشہ ایک ہی ہوتے کیونکہ وہ، ہم اور ہمارے گردوپیش کی اشیا ہمیشہ وہی ہوتیں ____ غیر متبدل اس

انسان کیلئے زندگی ایک عذاب ہے جس کا ماحول نباتی ہو۔ جتنا عرصہ وہ اِس ماحول میں بسر کریگا اسی قدر اس فضا کا سکون اس کیلئے ناقابل برداشت ہوتا جائیگا۔

ہم صنف نازک کے متعلق ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے کہ بعض اوقات وہ گفتگو ناگوار خاطر ہو جایا کرتی ـــــــ اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کر لیا جائے۔ کہ ہمارے خیالات عورتوں کے متعلق معقول ہو کرتے تھے۔ وہ صنف جس کے متعلق اظہار خیالات کیا گیا عورت کہلانے کی مستحق نہیں۔

ٹانیا کی شان میں ہمارے منہ سے کوئی گستاخ کلمہ نکلنے نہ پاتا۔ ـــ شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ہمارے پاس بہت کم عرصہ ٹھہرتی تھی ـــــ وہ ہماری نظروں کے سامنے آسمان سے ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح روشنی دکھلا کر پھر اوجھل ہو جاتی۔

اور یا اس کی وجہ اس کا حسن ہو کیونکہ ہر حسین چیز انسان کے دل میں اپنی وقعت اور عزت پیدا کر دیتی ہے ـــــ خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔

اِس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی۔ گو زندان ایسی مشقت نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا۔ مگر ہم پھر بھی انسان تھے ـ اور بنی نوع انسان کی طرح ہم بھی بغیر کسی کی پرستش کئے زندہ نہ رہ سکتے تھے۔

ہمارے لیے اس کی ذات سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور شئے نہ تھی۔ اس لئے کہ کہ بیسیوں انسانوں میں سے جو اس عمارت میں رہتے۔ ایک صرف وہی تھی۔ جو ہماری پرواہ کیا کرتی تھی ـــــ سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

ہر روز اس کے لیے بسکٹ مہیا کرنا۔ ہم اپنا فرض سمجھتے تھے۔

یہ نذرانہ ہوتا جو ہم ہر روز اپنے دیوتا کی قربانگاہ پر پیش کیا کرتے تھے آہستہ آہستہ یہ رسم ایک مقدس فرض میں تبدیل ہو گئی ۔ ہمارا اور اُس کا رشتہ باہم مضبوط ہو گیا ۔

بسکٹوں کے علاوہ ہم ٹائینا کو نصیحتیں بھی کیا کرتے۔ یہی کہ وہ اس سردی میں گرم کپڑے استعمال کیا کرے اور سیڑھیوں پر آرام سے اترا کرے ہماری ان نصیحتوں کو وہ مسکراتی ہوئی سنا کرتی اور ان پر کبھی عمل نہ کرتی اس کا یہ طرزِ عمل ہمیں کبھی ناگوار معلوم نہ ہوتا کیونکہ نصیحتوں کے پس پردہ ہماری صرف یہی خواہش ہوتی تھی ۔ کہ وہ اس بات سے باخبر ہو جائے کہ ہم اس کی حفاظت کر رہے ہیں ۔

بعض اوقات وہ ہمیں کچھ کام کرنے کیلئے کہتی ۔ جسے ہم بصد خوشی نہیں بلکہ فخر کے ساتھ کیا کرتے۔ لیکن جب ایک دفعہ ہمارے رفیق نے اسے اپنی قمیض دے کر پیوند لگانے کو کہا۔ تو اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا "دُر کیا نگوڑا یہی کام رہ گیا ہے میرے لیئے ۔

مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں ۔ "

ہم اپنے بیوقوف ساتھی کی اس حرکت پر خوب ہنسے اور پھر اسے کسی کام کے کرنے کو نہ کہا ۔

ہمیں اس سے محبت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر محبت کہا جائے ۔ تو سمجھ لیجیے ۔ کہ

تمام جذبات اسی لفظ میں نہاں ہیں ۔

انسان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے ۔ کہ وہ کسی کو اپنی محبت کا مرکز بنائے خواہ اس کا محبوب اس کی محبت کے بوجھ تلے پس ہی کیوں نہ جائے ۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ محبت کرتے وقت وہ اپنے محبوب کا احترام نہیں کرتا

ہم اگر ٹینیا کو محبت کرتے تھے ۔ تو مجبوری سے اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی اور شے موجود نہ تھی ۔ جس سے ہم محبت کر سکیں ۔

کبھی کبھی ہم میں سے ایک یہ سوچنے لگ جاتا کہ ہم سب اس لڑکی کے متعلق بے فائدہ سرگردانی کیوں کر رہے ہیں ؟ اس چھوکری کی محبت میں آخر ہمیں کیا ملیگا ؟

اس شخص کی جو ٹینیا کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات کہنے کی جرأت کرتا بہت بری حالت کی جاتی ۔

ہم چاہتے تھے کہ کسی سے محبت کریں ۔ اور اب چونکہ ہمیں وہ چیز جس کے ہم متلاشی تھے مل گئی تھی ۔ اس لیے ہم اس سے الفت کرتے اور وہ چیز جسے ہم جیسے اشخاص محبت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ امر لازم تھا کہ دوسرے اس کا احترام کریں ۔ اس لیئے کہ وہ ہماری مقدس عبادت گاہ تھی ۔ اور اگر کوئی شخص ہمارے نظریہ کے خلاف چلتا تو وہ ہمارا دشمن تھا ۔

اس میں کوئی شک نہیں لوگ اکثر اس چیز کو محبت کرتے ہیں ۔ جو حقیقت میں محبت کیے جانے کے قابل نہیں ہوتی ــــــ مگر یہاں ہم جیسے شخص ایک ہی

کشتی میں سوار تھے۔ اس لیئے ہم چاہتے تھے کہ اس چیز کو جسے ہم پیار کرتے ہیں، دوسرے مقدس خیال کریں۔ لبکٹ کے کارخانہ کے علاوہ ہمارا آقا ایک کیک بنانے والی فیکٹری کا مالک تھا۔ جو اس مکان میں واقع تھی۔ ہماری قبرنما کوٹھڑی اور اس فیکٹری کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ اس فیکٹری کے ملازم اپنے کام کو ہمارے کام سے اعلیٰ و مصفا خیال کرتے۔ ہمیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے اور یہی وجہ تھی، کہ ہمارے ساتھ بہت کم ملنے کی زحمت گوارا کرتے بلکہ جب کبھی انہیں صحن میں ہمارے ساتھ دوچار ہونے کا اتفاق ہوتا تو وہ ہمیں دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔

ہمیں ان کے کارخانہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی صرف اس لیے کہ ہمارے آقا کو شبہ تھا کہ ہم وہاں سے مکھن کے کیک چرائینگے۔

ہمیں بھی ان سے نفرت تھی ...... رشک تھا اس لیے کہ ان کا کام نسبتاً کم اور مزدوری کہیں زیادہ تھی۔ ان کیلئے خورد و نوش کا سامان ہم سے نہایت اچھا تھا۔ ان کے کام کرنے کی جگہ روشن و صاف اور وہ ہمارے برعکس تندرست اور مصفا تھے۔ اُن کے مقابلہ میں ہم سب زرد اور نحیف تھے ہم سے تین دائم المریض اور باقی تپ دق ایسی لرزہ خیز مرض میں مبتلا تھے۔ ..... ہم میں سے ایک بیچارہ تو گنٹھیا کی وجہ سے قریب قریب اپاہج ہو رہا تھا۔

تعطیل کے دنوں میں وہ خوبصورت لباس اور نئے روغن شدہ بوٹ پہن کر

باغ میں چہل قدمی کیلئے نکلتے . . . . . . اور ہم چیتھڑوں میں پھٹے ہوئے بوٹ پہنے ہوئے باغ کی جانب جاتے مگر پولیس ہمیں اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیتی۔ اِن حالات کی موجودگی میں یہ کب ممکن ہو سکتا تھا۔ کہ ہم ان کیک بنانے والوں کو محبت کی نظروں سے دیکھتے۔

چند روز ہوئے ہم نے یہ افواہ سنی کہ ان کا منتظم شراب نوشی کی وجہ سے نکال دیا گیا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک اور شخص کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو کسی زمانے میں سپاہی تھا۔

اِس سپاہی کے متعلق روایت تھی کہ وہ شوخ رنگ کی وسکٹ پہنے ایک بڑی سی سنہری زنجیر لٹکائے صحن میں گھوما کرتا ہے۔

ہم اُس نئے منتظم کو دیکھنے کے بہت شائق تھے۔ اِس کی ملاقات کی امید میں ہم سب نے باری باری صحن میں چکر کاٹے مگر بے سود۔

ایک روز وہ خود ہی ہمارے کارخانے میں چلا آیا۔

بوٹ کی ٹھوکر سے دروازے کو کھول کر وہ دہلیز پر کھڑا ہو گیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "خدا تمہارے ساتھ ہو! میرے بچو آداب عرض ہے۔"

بھٹی کا دھواں سیاہ بادلوں کی طرح چکر لگاتا ہوا گزر رہا تھا۔ جہاں سپاہی عجب پر رعب انداز میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو کمال صفائی سے تاؤ دے رکھا تھا جس میں سے زرد دانتوں کی لڑیاں ظاہر ہو رہی تھیں

وہ آج نیلے رنگ کی ایک بھڑکیلی کامدار واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس پر سنہری بٹن چاپچا چمک رہے تھے ـــــ سونے کی وہ زنجیر جس کے متعلق ہم نے سنا تھا بلاشک وشبہ اپنی جگہ پر موجود تھی۔

یہ سپاہی مضبوط دراز قد اور خوبصورت تھا۔ ـــــ اس کی بڑی اور روشن آنکھوں میں دوستی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

ایک کلف شدہ ٹوپی اس کے سر کی زینت ہو رہی تھی۔ اور اس کے پاجامہ کے پائنچوں سے تازہ رنگین شدہ بوٹ چمک رہے تھے۔

ہمارے نانبائی نے اس کی خدمت میں مودبانہ التجا کی کہ وہ دروازہ بند کر دے دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے آقا کے متعلق ہم سے طرح طرح کے سوالات کیے ہم نے ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے اسے بتلایا کہ ہمارا آقا خون چوسنے والا پسّو۔ غلاموں کا تاجر۔ انسانی اجناس فروخت کرنے والا گماشتہ اور ضرر رساں ہے ـــــ ہم نے ان خیالات کا اظہار بھی کیا جو ہمیں اپنے آقا کے متعلق تھے۔ مگر ان کا صفحہ قرطاس پر لانا ناممکن ہے۔

سپاہی سوالات کا جواب بڑے غور سے سنتا رہا مگر یک لخت جیسے وہ کسی گہری خواب سے چونک پڑا ہو کہنے لگا "تم لوگوں کے پاس چھوکریاں تو بہت ہونگی ؟"

اس پر ہم میں سے بعض تو ہنس پڑے۔ اور بعض نے افسردہ منہ بنالیے آخر ہم میں سے ایک نے سپاہی پر واضح کر دیا۔ کہ ہمارے گرد و نواح میں چھوکریاں ضرور موجود تھیں

______ کوئی درجن ایک کے قریب -

اس پر سپاہی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ان سے تفریح بھی ہوا کرتی ہے؟“

ہم پھر ہنس پڑے ______ ہم میں سے اکثر اس امر کے خواہشمند تھے کہ سپاہی پر واضح کر دیں کہ وہ چھوکریاں جن کے متعلق وہ اس قسم کی گفتگو کر رہا ہے بعینہ اسی کی مانند تیز وطرار ہیں ______ مگر یہ بات کہنے کی ہم میں سے کسی کو جرأت نہ تھی پھر بھی ہم میں سے ایک نے دبی زبان میں یہ کہہ ہی دیا۔

اس حالت میں جس میں ہم ہیں ______ ”درست ہے!!! اس حالت میں اس قسم کی تفریح تمہارے لیے ناممکن۔ دراصل تمہیں اپنی موجودہ حالت میں نہیں رہنا چاہیے اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تمہاری قسمت بری ہے ______ میرا مطلب سمجھے ہونا ______ اور عورتیں تم جانتے ہو۔ اس مرد کو پسند کرتی ہیں۔ جو وضعدار ہو۔ جوان اور خوبصورت ہو اس کے علاوہ وہ مردمیں طاقت اور قوت کی بھی عزت کرتی ہیں ______ اس بازو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے “

سپاہی نے آستین چڑھا کر بازو کو کہنی تک ننگے کرتے ہوئے کہا۔ بازو مضبوط اور سپید رنگ کا تھا جس پر سنہری بال چمک رہے تھے۔

”ٹانگیں اور چھاتی بھی اسی طرح مضبوط ہے ______ گوشت سے بھری ہوئی ______ اب طاقت کے علاوہ مرد کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ بہترین لباس زیب تن کرے ______ میری طرف دیکھو تمام عورتیں مجھے محبت کرتی ہیں حالانکہ میں نے ان کے بارے میں کبھی

کوشش کی ہی نہیں ـــــ ایسی درجنوں ہیں "

یہ کہہ کر وہ ایک ٹوکری میں بیٹھ گیا اور ہمیں یہ سنانا شروع کیا کہ عورتیں اس کی محبت میں کسطرح گرفتار ہوتی ہیں اور وہ ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔

اس کی روانگی کے بعد ہم عرصہ تک خاموش رہے اور اس عرصہ میں اس کے عشق کے افسانوں کی بابت سوچتے رہے۔

اس خاموشی کے بعد دفعتاً ہم گفتگو میں مشغول ہو گئے جس میں اتفاق آراء سے سپاہی کو خوش خلق اور ملنسار قرار دیا گیا۔

وہ بہت حلیم اور خوش طبع تھا جبکہ اس نے ہمارے ساتھ اس طرح گفتگو کی جیسے وہ ہم ایسا ہو ـــــ ہمارے پاس آج تک کوئی ایسا شخص نہ آیا تھا جس نے ہمارے ساتھ اس قسم کی دوستانہ گفتگو کی ہو،

ہم عرصہ تک اس کی مستقبل قریب میں ان کامیابیوں کے متعلق اظہار خیالات کرتے رہے جو اس فیکٹری میں لڑکیوں کی محبت جیتنے میں حاصل ہونی تھیں ـــــ ان لڑکیوں کی محبت جو ہماری طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتیں جیسے انہیں ہم سے کوئی غرض ہی نہیں اور یا جن کو ہم للچائی نظروں سے دیکھتے جبکہ وہ صحن میں مختلف قسم کے خوبصورت لباس پہن کر گزر رہی ہوتیں۔

"ڈرائنیا کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ کہیں وہ سپاہی کی گرفت میں نہ آجائے۔"

نانبائی نے دفعتاً دیگر آواز میں کہا۔

اِن الفاظ نے ہم پر بہت اثر کیا۔ اس لیے ہم خاموش رہے۔

ٹانیا کا خیال ہمارے دماغوں سے تقریباً" محو ہو چکا تھا ____ سپاہی کے خوبصورت اور مضبوط جسم نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد بحث شروع ہو گئی ہم میں سے بعض کو یقین تھا کہ ٹانیا ایک معمولی سپاہی کی خاطر اپنی عصمت کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دے گی۔ مگر بعض کا یہ خیال تھا کہ وہ سپاہی کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

ہم میں سے چند ایک نے رائے دی۔ کہ اگر سپاہی اپنی خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرے تو اس کی پسلیاں کچل ڈالی جائیں۔

اس بحث کے اختتام پر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ ہم سب ٹانیا کی حفاظت کریں اور اُسے آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیں۔

ایک ماہ گزر گیا۔

سپاہی حسب معمول اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس دوران میں وہ ہمارے کارخانہ میں کئی دفعہ آیا مگر چھوکریوں پر فتح پانے کے قصوں کی بابت ایک حرف تک زبان پر نہ لانا۔

ٹانیا بھی ہر روز صبح کو اپنے بسکٹوں کی خاطر آتی۔ اس کا رویہ حسب دستور ویسا ہی دوستانہ تھا۔ ہم نے اسے سپاہی کے متعلق آگاہ کرنا چاہا۔ مگر ان ناموں سے جس سے وہ اسے پکارتی ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ اس کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔

ہمیں اپنی ننھی لڑکی ٹامینا پر ناز تھا جبکہ ہم روز سپاہی کے ساتھ کوئی نہ کوئی لڑکی دیکھتے تھے۔ ٹامینا کے اس باوقار رویہ نے ہمارے حوصلوں کو بڑھا دیا۔ اب ہم اس کی ــــ اس کی عصمت کے نگہبان سپاہی کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس کے برعکس اس کی عظمت ہمارے دلوں میں دن بدن بڑھتی گئی۔

ایک روز سپاہی شراب سے مخمور ہنستا ہوا ہمارے کمرہ میں داخل ہوا۔ جب ہم نے اس کے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا " دو چھوکریاں مجھ پر آپس میں لڑ رہی ہیں ــــ انہوں نے کس طرح ایک دوسرے کو ذلیل کیا۔

ہاہاہا ــــ ایک دوسرے کے بال پکڑ کر وہ زمین پر گر پڑیں ــــ ہاہاہا ــــ اور دیوانی بلیوں کی طرح نوچنا شروع کر دیا ــــ اور میرا ہنسی کے مارے برا حال ہوا جا رہا تھا ــــ مجھے تعجب ہے کہ عورتیں صاف لڑائی کیوں نہیں لڑتیں ــــ نوچنے کا فائدہ ؟ "

وہ بنچ پر بیٹھا ہوا کسقدر تندرست اور مصفا نظر آ رہا تھا۔ ہم خاموش تھے اس لیے کہ اس کی آمد ہمیں ناگوار گزر رہی تھی۔

" میں اس معمہ کو حل کرنے سے قاصر ہوں ــــ خدا جانے عورتیں مجھ پر کیوں فریفتہ ہیں ــــ بس آنکھ جھپکنے کی دیر ہے اور ــــ یہ کہتے ہوئے سپاہی اپنے سپید بازوؤں کو ہوا میں حرکت دے رہا تھا۔ اور ہماری طرف دوستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

" ننھے پودوں کو اکھاڑ لینا کوئی جوانمردی نہیں۔ مزا تو جب ہے کہ کسی مضبوط درخت

گوگرایا جائے۔" ہمارے نانبائی نے غصہ کی وجہ سے آہنی سلاخ کو بھٹی میں تیزی سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"تو مجھ سے مخاطب ہوگیا؟" سپاہی نے دریافت کیا۔

"ہاں! تمہیں سے مخاطب ہوں"

"اس سے تمہارا مطلب۔

"کچھ بھی نہیں ـــــ کچھ بھی نہیں۔

"ٹھہرو! ٹھہرو! وہ کون سا مضبوط درخت ہے۔ جس کا تم ذکر کر رہے ہو

نانبائی اس کا جواب نہ دیا۔ اور بھٹی سے پکے ہوئے بسکٹ نکالنے میں مشغول رہا۔ اس سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ سپاہی اور اس کی گفتگو کو بالکل بھول چکا۔ مگر سپاہی بہت بے چین ہوا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھٹی کے قریب آیا اور کہا

"کہو لو! ـــــ کس عورت سے ذکر کر رہے تھے۔ ـــــ تم نے میری ہتک کی ہے۔ کوئی عورت مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔

اس کی گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ نانبائی کی گفتگو سے سخت ناراض ہوگیا ہے۔ غالباً اس کو اس بات پہ بہت فخر تھا کہ اس میں عورتوں کو مسخر کرنے کا وصف موجود ہے۔ ورنہ درحقیقت سوائے اس وصف کے اس شخص میں زندگی کے متعلق کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ اسی ایک رہے سہے وصف کی رُو سے وہ آپ اپنے آپ زندہ انسان کہلانے کا مستحق ہو سکتا تھا۔

دنیا میں ایسے افراد موجود ہیں۔ جو بیماری کو خواہ وہ روحانی ہو یا جسمانی زندگی کا ایک بیش قیمت جزو سمجھتے ہوئے اس کی تمام زندگی بھر پرورش کرتے رہتے ہیں۔ اور اسی میں اپنی زندگی کا راز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسی زندگی عموماً تکلیف دہ ہوتی ہے مگر وہ اس پر از مصائب زندگی کے متعلق دوسروں سے شکایت ضرور کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اپنے ہمسایہ انسانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ اور اس طرح وہ انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھیں۔

اگر ایسے افراد سے یہ بے چینی۔ کرب اور تکلیف چھین لی جائے۔ ان کے درد کی دوا کر دی جائے۔ تو وہ پہلے کی طرح شادماں نہ ہوں گے۔ اس لیئے کہ ان کی زندگی کا آخری سہارا ان سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

کھوکھلے برتن کی طرح مانند ہوں گے۔ بعض اوقات ایک انسان کی زندگی اس قدر تنگ اور غربت زدہ ہوتی ہے۔ کہ وہ بے قصد کسی معیوب چیز کو ہی محبت کرنے لگ جاتا ہے اور اسی پر زندہ رہنا چاہتا ہے۔ صاف لفظوں میں اکثر لوگ صرف دماغی بیکاری کی وجہ سے گناہ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

سپاہی سخت ناراض ہو گیا تھا۔ نانبائی کی طرف لپکا اور درشت لہجہ میں بولا دریں جو بار بار کہہ رہا ہوں کر لو لو ــــــ کس لڑکی کی بابت ذکر کر رہے ہو۔

"دیکھو پھر،، نانبائی نے سپاہی کی طرف اچانک مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہاں،،

"کیا تم ٹائینا کو جانتے ہو۔"

"کیوں؟"

"بس وہ لڑکی ہے ـــــ قابو میں لانے کی کوشش کرو۔"

"میں"

"ہاں! ہاں تم!"

"یہ تو بالکل معمولی بات ہے۔"

ہم بھی دیکھیں کیسے؟"

"تو پھر دیکھ لو گے؟" ـــــ ہاہاہا"

"وہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے گی"

"صرف ایک ماہ کی مہلت چاہتا ہوں۔"

"شیخ چلی مت بنو ـــــ میاں سپاہی۔

"اچھا چودہ روز سہی ـــــ اس کے بعد تم دیکھ لینا ـــــ کیا نام لیا تھا تم نے؟ ـــــ ٹائینا؟"

"اب جاؤ کام میں حارج ہو رہا ہے۔

"بس چودہ روز ـــــ اور وہ میرے قابو میں ہو گی ـــــ تمہاری قسمت!!"

"میں کہتا ہوں یہاں سے دور ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر نانبائی وحشیوں کی طرح غضبناک ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سپاہی سخت حیران ہوا اور خاموشی سے یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ "بہت اچھا"

اِس بحث کے دوران میں ہم سب خاموش رہے اس لیے کہ ہم انکی باہم گفتگو کو بہت غور سے سن رہے تھے۔ لیکن جونہی سپاہی رخصت ہوا ہمارے درمیان گفتگو کا ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا ہم میں سے ایک نے نانبائی کو چلاتے ہوئے کہا "تمہیں کیا شرارت سوجھی ہے کام کئے جاؤ اپنا ——— سنا ہے یا نہیں"۔ نانبائی نے تندی سے جواب دیا۔

ہمیں دراصل اس امر کی فکر لاحق ہو رہی تھی کہ چونکہ سپاہی اپنے الفاظ کو پورا کرنے کی کوشش ضرور کریگا۔ اس لئے ٹاٹینا کی عصمت خطرے میں ہے۔

مگر باوجود اِس کے ہم اس بحث کا نتیجہ دیکھنے کیلئے سخت بیقرار تھے ——— اس بحث کا نتیجہ جو کسی حالت میں بھی خوشگوار نہ تھا۔

کیا ٹاٹینا ضرور ثابت قدم رہے گی۔"

ہم اپنے ننھے دیوتا کی ثابت قدمی واستقلال کے امتحان لینے کی عرصے سے خواہش تھی۔ لیکن اب ہم نے آپس میں یہ ثابت کر دیا کہ ٹاٹینا اس امتحان میں ضرور سُرخرو ہو گی اس دن سے ہماری زندگی ایک عجب قسم کی زندگی ہو گئی جس سے ہم بالکل ناآشنا تھے ہم آپس میں پہروں بحث کرتے رہتے تھے جیسے ہم پہلے کی نسبت زیادہ عقلمند و ذی فہم بن گئے ہوں اور ہماری گفتگو کچھ معنے رکھتی ہو۔

اب ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم شیطان سے بازی لگا رہے ہیں۔ اور ٹاٹینا کی عصمت ہماری طرف سے داؤ ہو۔

جب ہم نے کیک بنانے والے نانبائی سے یہ خبر سنی۔ کہ سپاہی لتے ٹاٹینا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں سخت رنج پہنچا۔ اور ہم اس رنج کو مٹانے کیلئے اس قدر منہمک تھے کہ ہم کو یہ معلوم تک نہ ہوا کہ آقا نے ہماری بے چینی و اضطراب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدہ میں تین سیر کا اضافہ کر دیا۔

اس اضطراب کے دوران میں کام کرتے ہوئے ٹاٹینا کا نام ہر وقت ہماری وردِ زبان ہوتا۔ اور ہم ہر روز صبح کو اس کا انتظار کیا کرتے ــــــ غیر معمولی بے صبری کے ساتھ۔

وہ ہر روز ہمارے پاس آتی مگر ہم نے سپاہی والی تکرار کا اس کے ساتھ ذکر تک نہ کیا اور نہ ہی اس سے کسی قسم کے سوالات کئے۔ بلکہ حسبِ معمول جذبہ الفت سے ملتے رہے مگر اس جذبہ الفت میں کسی نئی چیز کی جھلک تھی ــــــ تیز تجسس کی جھلک ــــــ خنجر کے پھل کی مانند تیز اور سرد۔

"دوستو! میعاد کا وقت آج کے روز پورا ہو جائیگا" نانبائی نے صبح کے وقت کام شروع کرتے ہوئے کہا۔

ہمیں مطلع کرنے سے پیشتر ہی اس امر کا علم تھا۔ مگر پھر بھی یہ سن کر ہم سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔

"ابھی ابھی آئیگی ـــــ ذرا غور سے دیکھنا اُسے" نابینائی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے ـــــ آنکھیں کچھ بتا سکیں گی" ہم میں سے ایک نے پرسوز لہجہ میں کہا۔ اس پر بحث چھڑ پڑی۔ آج کے روز ہمیں معلوم ہو جانے والا تھا کہ وہ برتن جس میں ہم سب نے اپنے دل رکھے ہوئے ہیں۔ کتنا صاف اور بے لوث ہے۔ صرف آج کی صبح ہم کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے ہم کوئی بڑی کھیل کھیل رہے جسمیں ہمیں اپنے معبود کے کھو جانے کا اندیشہ ہو۔

گذشتہ چند دنوں سے ہم سن رہے تھے۔ کہ سیاہی حصول مقصد کیلئے ٹاٹینا کے پیچھے سایہ کیطرح لگا ہوا ہے۔ ٹاٹینا حسب معمول بسکٹوں کیلئے ہر روز آتی۔ مگر ہم اس سے سپاہی کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کرتے۔

ہم خود متعجب تھے کہ کیوں؟ آج کے روز بھی ہم نے اسے یہ کہتے ہوئے سُنا:۔

"ننھے قیدیو" ـــــ میں آگئی ہوں ـــــ اس پر ہم سب آگئے اور جب وہ اندر آگئی تو ہم خلاف معمول اسے خاموشی سے ملے۔ گو ہماری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر ہمیں معلوم نہ تھا کہ سلسلہ کلام کیونکر شروع کریں ـــــ ہم خاموشی اور حیرت کی تصویر بنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

اس انوکھے اور خلاف معمول استقبال کو دیکھ کر وہ سخت حیران ہو گئی ـــــ اچانک اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

بے چین و مضطرب دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟"

"تم اپنی سناؤ۔" نابینائی نے درد انگیز لہجہ میں کہا

"اپنی؟ ـــــ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ بھی نہیں ـــــ کچھ بھی نہیں"

"تو چلو مجھے بسکٹ دو ـــــ ذرا جلدی کرو"

اس سے قبل اس نے آج تک اتنی پھرتی نہ دکھائی تھی۔

"تم جلدی کر رہی ہو۔" نابینائی نے ٹامنیا سے آنکھیں جدا نہ کرتے ہوئے کہا

اس پر وہ دفعتاً اٹھی اور دروازہ سے باہر بھاگ گئی۔

نابینائی نے اپنی سلاخ پکڑی اور بھٹی کی طرف جاتے ہوئے دبی زبان کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے ـــــ کہ وہ اب اسکی ہے ـــــ آہ! یہ سپاہی ـــــ حرامزادہ ـــــ بدمعاش"۔

اس پر ہم بھرطیوں کے ریوڑ کی طرح اپنے شانوں کو ہلاتے ہوئے میز کی طرف بڑھے اور خاموشی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

"لیکن کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے ـــــ؟" ہم میں سے کسی نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بس! بس ـــــ بولنے کی کیا ضرورت ہے" نابینائی نے چیختے ہوئے جواب دیا

ہمیں معلوم تھا کہ نانیائی عقلمند ہے ۔

ہم سے کہیں زیادہ عقل مند۔ اس لیے اس کے چلانے سے ہم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ سپاہی کی فتح و کامیابی کا اعتراف کر رہا ہے ۔

یہ خیال کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مصیبت زدہ اور بے چین پاتے ۔

بارہ بجے یعنی دوپہر کے کھانے کے وقت سپاہی آیا۔ اور حسب معمول خوش و خرم ہماری نظروں سے نظریں ملا کر دیکھنے لگا۔ معزز دوستو اگر چاہتے ہو کہ میں تمہیں آج اپنی کامیابی کا نمونہ دکھلاؤں ——— تو صحن کے ساتھ والے کمرے میں جا کر کھڑکیوں میں سے جھانک کر دیکھو۔

سمجھ گئے ؟" سپاہی نے پُرفخر لہجہ میں ہنستے ہوئے کہا ۔

سپاہی کے کہنے پر ہم صحن کے ملحقہ کمرہ میں چلے گئے اور اپنے چہرے کھڑکیوں کے روزنوں کے ساتھ جما دیئے ۔

ہمیں بہت عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ جلد ٹائینائر قدم اٹھاتی ہوئی صحن کے چھپروں کے پاس سے جو کہ کچرا اور ردی سے بھرے ہوئے تھے گذری ——— اس کے چند منٹ بعد سپاہی نمودار ہوا۔ جس کا رخ ٹائینا کی طرف تھا۔ بڑے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے ۔ سیٹی بجاتا ہوا وہ بھی ٹائینا کی طرح ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

——— اسی اثنا میں بارش شروع ہو گئی ۔ اور ہم بارش کے قطروں کو جو چھپڑوں میں گر کر عجیب شور پیدا کر رہے تھے ۔ خاموشی سے دیکھنے لگے ۔

بارش کی وجہ سے آج کا دن بہت اداس اور مرطوب تھا ۔ مکانوں کی چھتوں پر برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور زمین کیچڑ سے لت پت ہو رہی تھی ۔ بارش سسکیاں بھرتی ہوئی زمین پر گر رہی تھی ۔

گو ہمیں اس سردی میں اس طرح کھڑے رہنا ناگوار گزر رہا تھا ۔ مگر چونکہ ہم ٹانئیا کی بیوفائی پر سخت برانگیختہ تھے ۔ کہ اس نے ایک معمولی سپاہی کی خاطر ہم سب کو چھوڑ دیا ۔ اِس لیے ہم جلادوں کی سی ہولناک خوشی سے اس کا انتظار کرنے لگے ۔

تھوڑے عرصہ بعد ٹانئیا واپس آگئی ــــــ اس کی آنکھیں ــــــ ہاں اس کی آنکھیں کسی نامعلوم خوشی و انبساط سے چمک رہی تھیں ــــــ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے وہ جھومتی ہوئی چلی آ رہی تھی جیسے خواب ہو ۔

ہم اس منظر کو خاموشی سے نہ دیکھ سکے اس لیے دروازہ سے نکل کر صحن کی طرف دیوانہ وار بھاگے گئے ۔ اور اس پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر دی ۔ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر وہ کانپی اور ٹھہر گئی ۔ جیسے وہ کیچڑ میں گر پڑی ہو ۔ ہم سب اس کے گرد جمع ہو گئے ۔ اور بغیر کچھ کہے سنے جی بھر کے لعن طعن کی ۔ اور شرمناک سے شرمناک گالیاں سنائیں ۔ ہم نے ایسا کرتے وقت اپنی آوازوں کو شور میں نہ پڑنے دیا بلکہ اس موقع سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے درمیان گھری ہوئی وہ کہیں نہیں جا سکتی اور ہم جتنا عرصہ چاہیں اپنے دل کا بخار نکال سکتے ہیں اگر چہ آئی ہے تو اس بات کی کہ ہم نے اسے مار پیٹ کیوں نہ کی ۔

وہ ہمارے درمیان گھری ہوئی گالیوں کو خاموشی سے سن رہی تھی ـــــ اور ہم گالیوں اور طعنوں کے ذریعہ اپنی آگ اُگل رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے چہرہ کا رنگ اتر گیا ـــــ اس کی نیلگون جو کچھ عرصہ پہلے فرطِ مسرت سے چمک رہی تھیں اب پھٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اِس کی چھاتی بڑے زور سے متلاطم تھی۔ اور اِس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے ـــــ اور ہم اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنی انتقام کی آگ بجھا رہے تھے۔ اِسلئے کہ اِس نے ہمیں دھوکہ دیا تھا۔

وہ ہماری تھی چنانچہ ہم نے اس کی خدمت میں اپنے اپنے دل پیش کئے گو وہ بھکاری کے ٹھکرے سے زیادہ قیمتی نہ تھے مگر اِس نے چھبیس دلوں کو ایک سپاہی کی خاطر ٹھکرا دیا۔ ہم اسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور وہ خاموشی سے ایک تعاقب زدہ شکار کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے، سراپا ارتعاش ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

اِس موقعہ پر اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔

ہم میں ایک نے ٹاٹیا کی آستین پکڑ کر کھینچ لی جس پر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی اور اپنے سر کو ذرا اوپر اٹھا کر بالوں کو سنوارتے اور ہماری طرف گھورتے ہوئے دفعتاً بولی " اونہہ ـــــ جیل، کے ذلیل پرندے "

یہ کہتی ہوئی وہ ہمارے پاس سے بغیر کسی جھجک کے گزر گئی۔ جیسے ہم اِس

کے راستہ میں حائل ہی نہ تھے ـــــــــــ اس کی اس دلیری نے ہمیں اس بات کی جرأت نہ دی۔ کہ ہم اسے روک لیں۔

ہمارے پاس سے گزرتی ہوئی وہ حقارت آمیز لہجہ میں بولی "وہ کمینہ اور ناپاک انسان"۔

یہ کہتے ہوئے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور ہم صحن میں کیچڑ اور برف کے تودوں کے درمیان، گرتی ہوئی بارش، سورج سے محروم آسمان تلے کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم خاموشی سے اپنے سنگین قفس میں چلے آئے جہاں سورج کی جاں بخش شعاعیں حسب معمول ہم تک کبھی نہ پہنچیں ـــــــــــ "تانیا" پھر کبھی نہ آئی"۔

۱:- پتھر کی سرگذشت

۲:- مساوات

سلوگپ

پتھر کی سرگذشت

شہر میں پتھر کی ایک سڑک تھی ۔

گزرتی ہوئی گاڑی کے پہیے نے ایک پتھر کو دوسرے پتھروں سے جدا کر دیا۔ اس پتھر نے دل میں سوچا۔ "مجھے اپنے ہمجنسوں کے ساتھ موجودہ حالت میں نہیں رہنا چاہئیے بہتر یہی ہے کہ میں کسی اور جگہ جا کر رہوں ۔

ایک لڑکا آیا۔ اور اس پتھر کو اٹھا کرلے گیا ۔

پتھر نے دل میں خیال کیا۔ "میں نے سفر کرنا چاہا۔ تو سفر بھی نصیب ہو گیا ــــ صرف آہنی ارادہ کی ضرورت ہے ۔" لڑکے نے پتھر کو ایک گھر کی جانب پھینک دیا۔

پتھر نے خیال کیا۔ میں نے ہوا میں اڑنا چاہا تھا۔ یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ صرف ارادہ کی دیر تھی۔ پتھر کھٹ سے کھڑکی کے شیشہ پر لگا۔

شیشہ یہ کہہ کر چکنا چور ہو گیا "بد معاش ــــ اس حرکت سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" تم نے بہت اچھا کیا جو میرے راستے سے ہٹ گئے میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے راستے میں حائل ہوں" ہر ایک چیز میری مرضی کے مطابق ہونی چاہیے ۔ یہ میرا اصول ہے یہ کہہ کر پتھر ایک نرم بستر پر جا پڑا۔

پتھر نے بستر پر پڑے ہوئے خیال کیا۔ "میں نے کافی سفر کیا ہے۔ اب ذرا دو گھڑی آرام تو کر لوں ۔"

ایک لوکر آیا۔ اور اس نے پتھر کو لبستر پر سے اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دیا سڑک پر گرتے ہی پتھر نے اپنے ہمجنسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھائیو! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ ــــــــ میں ابھی ابھی ایک عالیشان عمارت سے ہو کر آ رہا ہوں لیکن اسکی شان و شوکت مجھے بالکل متاثر نہ کر سکی میرا دل تم لوگوں کی ملاقات کیلئے بیتاب تھا۔ چنانچہ اب میں واپس آ گیا ہوں۔

مساوات

ایک بڑی مچھلی نے ایک ننھی سی مچھلی کو پکڑ لیا۔ اور اسے نگل جانا چاہا۔

"ننھی مچھلی نے چلا کر کہا۔ "یہ سراسر بے انصافی ہے۔ میں تمہاری طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ قانون کی نظر میں ہم سب مچھلیاں یکساں ہیں۔"

بڑی مچھلی نے جواب دیا۔ "میں تم سے اس بات پر ہرگز بحث کرنے کیلئے تیار نہیں کہ ہم سب ایک ایسے ہیں۔ اگر تم میرا شکار ہونا پسند نہیں کرتیں تو آؤ مجھے اپنا شکار بنالو آؤ نا!" "مجھے نگل لو۔ ڈرتی کا ہے کو ہو"

چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی کو نگلنے کیلئے منہ کھولا۔ مگر بے سود۔

آخر کار تنگ آ کر کہنے لگی۔ "تم مجھے نگل لو۔"

"سلوگب"

جادُوگر

جادوگر

شہر میں سخت بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ہڑتال پہ ہڑتال ہو رہی تھی۔ یہ فتنہ کارخانہ سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ آگ کی طرح شہر کے ہر گوشہ میں پھیل گیا۔

اس شورش کو فرو کرنے کیلئے پولیس ہر ممکن کوشش کو عمل میں لائی۔ مگر بے سود وہ شورش ہٹنے والی نہ تھی۔

شہر اگرچہ پہلے کی طرح گوناگوں دلچسپیوں کا مرقع تھا۔ اس کے بازاروں میں ویسی ہی رونق قائم تھی۔ اور خرید و فروخت حسب معمول جاری تھی۔ مگر باایں ہمہ کوئی شخص بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ کہ شہر میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ رہی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ ایک عظیم ہیجان کا موجب بن رہا ہے۔

برقنداز کی سیٹی کی آواز لوگوں کے دلوں پر بہت ہیبت طاری کر دیتی تھی۔ اکثر لوگ تو سیٹی کی آواز سن کر دوڑ جاتے کہ دیکھیں کیا ماجرا ہے۔ مگر بعض اپنے آپ کو دوکانوں میں چھپا لیتے ــــــ مگر وہ آخر کس سے چھپ رہے تھے؟ ــــــ وہ کونسی شے تھی۔ جو انہیں اسقدر خوفزدہ کر رہی تھی؟ لیکن یہ کسی شخص کو معلوم نہ تھا۔ اور پھر بھی ہر شخص کو ڈر تھا کہ کوئی خوفناک اور ہیبتناک واقع ضرور پیش ہو کر رہیگا۔

عموماً چیتھڑوں میں ملبوس مزدور بازار میں کھڑے دبی زبان میں باتیں کرتے نظر آتے راستہ پہ چلتے ہوئے وہ امیر لوگوں کی طرف حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ مگر وہ ان کے زرد اور غلیظ چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

ایسے شخص اپنے بھدے اور غلیظ لباس سے ان بازاروں کی خوبصورتی کو جو بہار کے جاں آفریں موسم میں عروس نو بہار کی طرح سجے ہوئے تھے ملوث کر رہے تھے۔ یہ عجیب شخص ناخواندہ مہمانوں کی طرح شہر کے پارونق بازار میں آوارہ چکر لگاتے۔ مگر ان سے کوئی شخص ہمکلام نہ ہوتا۔ کہ مبادا اس ان کے جسم بھی ویسے غلیظ ہو جائیں۔ لیکن جونہی کسی برقنداز کی ان پر نگاہ پڑ جاتی وہ لوگوں کے دلوں میں ارتعاش خفی پیدا کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں بھاگ جاتے تھے۔

"امی یہ مزدور ہیں کیا۔؟"

"ہاں! ہاں! لیکن تم چلتے جاؤ اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔"

"لیکن امی وہ بھاگ کیوں رہے ہیں؟"

"پولیس سے ــــــ دیکھو اب ایسی باتیں نہ کرو!"

"لیکن کیوں؟ ــــــ کیا انہیں سڑکوں پر چلنے کا حکم نہیں؟"

"انہیں اجازت نہیں۔"

"انہیں اجازت کیوں نہیں۔؟"

"خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو ــــــ اپنا ہاتھ مجھے پکڑاؤ اور جلدی جلدی

چلنے کی کوشش کرو ـــــ نہیں تو ہمیں بھی کسی برقنداز کا کوڑا ــــ"
سرگ نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا مزدوروں کے گروہ کے منتشر ہونے پر ماں سخت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کی اس وقت صرف یہی خواہش تھی۔ کہ کسی طرح وہ اپنے مکان میں پہنچ جائے۔

"کیا یہ مزدور شریر ہیں امّی ؟"

"کون ؟ ـــــ کون ؟"

"مزدور"

"مجھے معلوم نہیں ـــــ وہ اچھے بھی ہیں اور برے بھی ـــــ مگر وہ کام ہی نہیں کرتے۔"

"کیا وہ مست ہیں ؟"

"ہاں ہاں! ـــــ مگر تم ٹھہرو مت ـــــ اور ان کی طرح مست نہ بنو۔"

"کیا وہ برے ہیں امّی ؟"

وہ ابھی جواب بھی نہ دینے پائی تھی۔ کہ چند گھوڑ سوار سپاہی بازار میں نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے گھوڑے کے ایک کوڑا رسید کیا۔
کوڑے کی آواز سرگ کی ماں کے کانوں میں اس طرح گونجی جیسے بندوق کی آواز وہ چلائی اور بغیر کرایہ طے کئے سرگ کو ایک گاڑی میں دھکیل کر کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجہ میں کہا "جلدی کرو ـــــ جہاں تک جلدی ہو سکے۔"

"مگر کہاں، مادام"، کوچوان نے مؤدبانہ کہا۔

"تم سیدھے چلے چلو ـــــــ آہ میرے خدا ـــــــ جلدی چلو۔"

"خوف مت کیجئے مادام وہ ہمیں ہاتھ تک نہیں لگائیں گے"۔

جب گاڑی بازار کا پہلا موڑ مڑی تو سرگ کی ماں کی جان میں جان آئی اور اطمینان کا سانس لے کر بولی۔

"دیکھو ـــــــ میں تمہیں ساڑھے چار آنہ سے زیادہ کرایہ نہیں دینے کی"

"مگر یہ کرایہ مناسب نہیں محترمہ!"

"تو پھر گاڑی ٹھہرالو ـــــــ ہم ٹریم کار میں گھر چلے جائیں گے۔"

"بہت بہتر مادام ـــــــ مگر مجھے ڈر ہے کہ آپ کو بے فائدہ وقت ضائع کرنا پڑیگا ـــــــ ٹریم کاریں آج نہیں چلیں گی۔"

"کون کہتا ہے؟"

"میں نے کل سنا تھا۔ کہ ٹریم کار چلانے والے مزدور ہڑتال کر رہے ہیں۔"

اسی اثنا میں مزدوروں کا ایک گروہ گاڑی کے قریب سے گزرا۔ سرگ کی ماں پھر خوفزدہ ہوگئی۔ اور کوچوان کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی تیز چلائے۔

سرگ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا اس گروہ کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ پولیس ان لوگوں کے پیچھے اتنی سرگرداں کیوں ہو رہی ہے۔

اگر وہ کام نہیں کرتے ـــــ تو نہ کریں ـــــ کچھ عرصہ کے بعد بھوک سے تنگ آکر خود ہی سرنگوں ہو جائیں گے۔"

"آپ درست فرما رہی ہیں مادام! ـــــ آپ ایک حیوان کو فاقہ کشی کے حربہ سے مطیع کر سکتے ہیں اور یہی حربہ انسان کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے مگر ایک غریب انسان کو اس طرح آزار پہنچانا گناہ ہے ـــــ گناہِ کبیرہ!" کوچوان نے اپنی داڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر کوچوان پھر سرگ کی ماں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "دیکھئے آپ ایک قیمتی جبہ پہنے ہوئے ہیں اور میں ایک عمدہ کوٹ مگر یہ بتلائیے۔ ان دونوں چیزوں کو تیار کرنے والا کون ہے؟"

"اس کے متعلق زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے پاس بھی روپیہ ہو تو تم بھی ایسے قیمتی کپڑے پہن سکتے ہو ـــــ اگر ہمارے آدمی کام نہیں کرینگے۔ تو کیا غیر ممالک سے چیزیں منگائی نہیں جا سکتیں؟"

"لیکن اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو گئے تو ـــــ یعنی اگر ریلوے کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی تو پھر آپ وہ چیزیں کہاں سے منگوائیں گے؟"

"ایسا خیال کرنا محض بے وقوفی ہے ـــــ گورنمنٹ بھلا کیا ایسا کرنے کی اجازت دے گی۔؟"

"معلوم نہیں مادام! مگر میں نے سنا ہے کہ ریل والے بھی عنقریب ہڑتال کرنے والے ہیں۔"

سرگ ماں اور کوچوان کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ یہ سب کچھ سن کر سخت حیران تھا۔ کہ وہ لوگ جو دوسروں کے لیے کپڑے اور دیگر اشیائے تیار کرتے ہیں بازاروں میں پولیس سے اس طرح کیوں بھاگتے پھرتے ہیں۔

اس کی ماں نے ابھی ابھی اسے ایک نیا کوٹ خرید کر دیا تھا۔ جو اس وقت اس کے گھٹنوں پر کاغذ میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ سرگ بہت خوش تھا کہ اس کی ماں نے اُسے یہ کوٹ اس وقت سے پہلے ہی خرید کر دیا۔ جبکہ وہ وقت آرہا تھا کہ کپڑے تیار ہونے بھی بند ہو جاتے۔

"امی کیا میرا نیا کوٹ انہوں نے ہی تیار کیا ہے؟"

"ہر ایک چیز —— ننھے" میاں ہر ایک چیز انہی کی تیار کردہ ہے —— آپ کے جسم پر کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو انہوں نے تیار نہ کی ہو۔" کوچوان نے بجائے ماں کے جواب دیا۔

ماں نے سرگ کے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے سخت غصہ کے لہجہ میں کہا زیادہ بک بک نہ کرو سرگ! تمہیں کوچوان سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔" کوچوان چپ نہ ہوا اور اس موضوع پر دیر تک اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا، "معلوم نہیں وہ تمہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے۔" سرگ کی ماں نے کوچوان سے مخاطب ہو کر کہا۔

اس پر کوچوان چپ ہو گیا اور تمام راستہ اس بارے میں کوئی گفتگو نہ کی۔ سرگ خیالات کا ہجوم لئے گھر میں داخل ہوا وہ ہنوز یہ نہیں کہہ سکتا کہ مزدور بُرے

ہیں یا اچھے۔

"سونیا آج ہم نے مزدور دیکھے ـــــ مزدور" سرگ نے اپنی بہن کو پُراسرار لہجہ میں کہا۔

"وہ کس شکل کے ہیں سرگ؟"

"وہ ـــــ وہ کسانوں کی طرح ہیں میرے خیال میں" گھر میں ان شخصوں کی بابت جنہوں نے کارخانوں اور فیکٹریوں کو بند کر دیا تھا۔ اور کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہر روز گفتگو ہوتی مگر سرگ اِس گفتگو سے بھی کوئی نتیجہ برآمد کرنے میں قاصر رہا وہ تاحال وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ آیا وہ لوگ اچھے ہیں یا بُرے۔

ایک روز اس نے اپنے خادم آگنیش سے دریافت کیا۔ "کیا یہ لوگ کارخانہ کو بند کر سکتے ہیں؟"

"بہت آسانی سے ننھے آقا!"

"لیکن کس طرح؟"

"بس وہ کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔"

"لیکن ان کے بغیر کارخانہ چل ہی نہیں سکتا کیا؟"

"کارخانے کس طرح چلیں ننھے آقا! جبکہ اِن کے بغیر کوئی کام ہی نہیں ہو سکتا"

"اچھا تو یہ بات ہے" ـــــ اسی طرح میرا اپنا کوٹ بھی اِن کے بغیر نہیں تیار ہو سکتا۔"

"یقیناً"

"اور میرا چھوٹا کوٹ بھی۔"

"چھوٹا کوٹ، پاجامہ اور قمیض بھی ____ اگر وہ یہ سب چیزیں تیار نہ کرتے تو آپ ویسے ہی ہوتے۔ جیسے قدرت نے آپ کو پیدا کیا تھا۔

بالکل عریاں؟ ____ بے وقوف آدمی ____ مگر میری امی مجھے دوسرے ملک سے کپڑے منگوا دیتی۔"

"مگر اس طرح تمہیں بہت انتظار کرنا پڑتا ____ لیکن اگر وہاں بھی اس طرح ہڑتال ہوتی یا اگر ذرائع آمدورفت ہی بند ہو جاتے تو ____ ؟"

"ریل گاڑیاں بھی بند ہو جائیں گی کیا؟"

"اوہ تو ایسی ہی ہے۔"

"تو پھر میرے ابا کس طرح آئیں گے؟ ____ میں انہیں کس طرح مل سکوں گا؟"

"اس حالت میں انہیں پیدل سفر کرنا پڑیگا۔"

"خبردار جو ایسی بات کہی! میں امی کو کہہ دونگا کہ تم میرے ابا کی نسبت ایسے الفاظ استعمال کر رہے تھے۔"

یہ کہہ کر سرگ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔"

لیکن چند منٹ کے بعد اپنے کوٹ کی آستین کو پکڑ کر کہنے لگا "اور تم کہو گے یہ آستین بھی انہی کے ہاتھ کی سلی ہوئی ہے۔"

"کیوں نہیں ؟ ــــــ تمہاری والدہ نے صرف تمہیں جنم دیا ہے باقی ۔"

- -

- -

دو دن کے بعد ٹریم کاریں چلنی بند ہو گئیں ۔ اخبار شائع نہ ہوئے غسلخانوں پر قفل لگ گئے ۔ وہ بازار جو گیس سے بقعہ نور بنے ہوئے ہوتے تھے ۔ سخت تاریک ہو گئے ۔ اس کے دو دن بعد ریل گاڑیوں کی آمدرفت بھی یک لخت بند ہو گئی جس سے شہر میں سخت ہیجان برپا ہو گیا اور لوگ اپنے عزیز و اقربا کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے ۔

سرگ کا ابا کبھی کا گھر آگیا ہوتا مگر گاڑیوں کے بند ہو جانے کی وجہ سے گھر نہ پہنچ سکا اس واقعہ نے گھر بھر کو سخت ہیجان کر دیا تھا ۔ سرگ کو صحن میں کھیلنے کی اجازت نہ تھی اس لیے سارا دن کھڑکی میں بیٹھا بازار کے واقعات کو غور سے دیکھتا رہتا ۔

"کیا ابا گھر نہیں آئیں گے امی ؟"

"وہ مجبور ہیں سرگ ــــــ گاڑیوں کی آمدورفت ہی بند ہے ۔"

"امی ! کیا یہ مزدور لوگ جو چاہیں کر سکتے ہیں ؟"

"کیا ؟"

"میرا مطلب ہے کہ آیا یہ لوگ گاڑیوں کی آمدورفت بھی بند کر سکتے ہیں ۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے — مگر اب تم مجھے ستاؤ مت۔ اِتنا کہتے ہوئے سرگ کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

یہ دیکھ کر سرگ خاموش ہو گیا اور کھڑکی سے بازار کو حیران پریشان نگاہوں سے دیکھنے لگ گیا۔

"اگر میرے بس میں ہو تو اِن مزدوروں کو ایک ایک کر ہلاک کر ڈالوں"، اس نے اپنے دل میں کہا۔

شہر کی حالت لحظہ بہ لحظہ بد سے بدتر ہو رہی تھی — حالات پہلے کی نسبت زیادہ بدل رہے تھے — اب بازاروں میں وہ پہلی سی رونق نہ تھی — بہت سی دکانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے — رات کے وقت مسلح پولیس گشت لگاتی تاکہ شہر میں کوئی شورش برپا نہ ہونے پائے۔

ایک روز نصف شب کے قریب بازار میں اس قدر شور ہوا کہ سرگ اپنے بستر سے برہنہ پا بھاگ کر کھڑکی کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ تاکہ معلوم کرے وہ شور کیسا ہے کیا دیکھتا ہے۔ کہ بازار میں آگ کا الاؤ جل رہا تھا جس کے اردگرد لوگ وحشیوں کی طرح چل پھر رہے ہیں۔

سرگ نے سوچا کہ یہ چیزیں کسی خوفناک واقعہ کی پیش خیمہ ہیں۔ اس خیال نے اس کی رگوں میں خون منجمد کر دیا۔ یہ خیال کر کے کہ وہ جن بھوتوں کی طرح اسے آگ پر بھون کر کھا جائیں گے۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہو کر چلا اٹھا۔ "امّی! امّی! مجھے

سخت ڈر لگ رہا ہے"، یہ کہہ کر وہ بھاگا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا۔

"سرگ تم سوتے کیوں نہیں! جاؤ اپنے بستر پر جا لیٹو۔" ماں نے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔

"امی وہ دیکھو بازار میں آگ جل رہی ہے۔ مجھے اس بات سے ڈر لگتا ہے۔"

"جاؤ سرگ اپنے بستر پر جا لیٹو ـــــ یہ آگ واگ کچھ بھی نہیں۔ ـــــ کاش تمہارے ابا یہاں موجود ہوتے۔"

"امی ـــــ"

"ہاں میرے بچے۔"

"میں آپ کے پاس آجاؤں؟ ـــــ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟ میرے جگر کے ٹکڑے۔"

"جادوگر سے امی۔"

"وہ کونسا جادوگر۔"

"بہت سے جادوگر ہیں امی ـــــ مختلف قسم کے جادوگر۔"

"تو پھر میرے پاس آجاؤ۔"

سرگ خوشی خوشی اپنی ماں کے پاس جا لیٹا۔ اور اپنے آپ کو لحاف میں چھپا کر کہنے لگا۔ "امی یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں؟"

اس کی ماں تو تھوڑی دیر کے بعد ہی سو گئی مگر سرگ لحاف سے منہ نکال کر

سوچنے لگا۔ کہ آیا وہ شخص بُرے ہیں یا اچھے مگر کوئی بھی قابلِ اطمینان نتیجہ نہ نکال سکا۔ دوسرے روز صبح کو جب سرگ کو ناشتہ ملا تو اُس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب گرم گرم بسکٹوں کی بجائے اس نے میز پر سخت اور ٹھنڈی روٹی کے ٹکڑے دیکھے۔

"مجھے بسکٹ لا کر دو۔ میں ایسی فضول چیز نہیں کھانے کا ——— تم بسکٹ کیوں نہیں لاتے؟"

سرگ نے خشک روٹی کے ٹکڑوں کو میز سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ننھے آقا"، آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیے۔ کہ ہمارے ہاں یہ خشک روٹی بھی موجود ہے یولو کرنے سرگ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ جاؤ جاؤ یہ اٹھا لو ——— اَمّی! امّی مجھے بسکٹ لا کر دو"

"سرگ پیارے! میں تمہیں بسکٹ کہاں سے لا کر دوں ——— بسکٹ بنانے والے کارخانے ہی بند ہیں"۔

"وہ کیوں؟"

"کارخانے کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے"

پھر وہی مزدور! سرگ اِن مزدوروں کی حرکت سے تنگ آ گیا تھا۔ تنگ آ کر بولا "مگر بسکٹوں کے بغیر صبح کا ناشتہ کیسے ہوگا؟"

"ہم تمہارے بسکٹوں کیلئے کوشش کریں گے"،

"کیا گورنر انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ کہ وہ بسکٹ تیار کریں۔"

"سرگ پیارے! گورنر بیچارہ کیا کرے وہ تو کسی کا حکم نہیں مانتے۔"

"گورنر کا بھی؟"

"گورنر کیا کسی کا بھی حکم نہیں مانتے"

"تو پھر وہ گورنر سے بھی بڑے ہوئے نا!!"

"سرگ ان باتوں کو چھوڑو اور خدا کا شکر کر کے یہی روٹی کھالو۔"

"میں تو ایسی بھدی روٹی نہیں کھانے کا عادی۔"

"مگر تمہیں مجبوراً کھانی پڑے گی۔"

"وہ کیوں؟"

سرگ کی حیرانی لحظہ بہ لحظہ اور روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ وہ سخت حیران تھا۔ کہ وہ لوگ جو کارخانوں کو چشم زدن میں بند کر سکتے ہیں۔ جو گورنر تک کا حکم نہیں مانتے پولیس سے اس طرح کیوں کر بھاگتے پھرتے ہیں۔

اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ویسے ہی جادوگر ہیں۔ جن کا حال میں عموماً کہانیوں میں پڑھا کرتا ہوں۔ اور یہ کہ ان کے پاس بھی ان جادوگروں کی طرح ایسی ٹوپیاں ہونگی جن کے پہننے سے وہ غائب ہو جاتے ہونگے۔

جب گورنر ان کو کام سے کہتا ہوگا۔ تو وہ جھٹ ٹوپی پہن گورنر کی آنکھوں سے غائب ہو جاتے ہونگے۔

بے چینی کی لہر آہستہ آہستہ بازاروں سے ہوتی ہوئی اُن سر بفلک محلات میں بھی داخل ہو گئی جن کے ساکنوں نے آج تک مصیبت اور تکلیف کا نام تک نہ سنا تھا۔ اب ان محلوں میں وہ پہلی سی شان و شوکت نہ رہی خوشی کے نغمے اور قہقہے جن سے ان کی دیواریں ہمیشہ گونجا کرتی تھیں ـــــ آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ ایا ان کی جگہ ایک نامعلوم خوف نے لے لی وہ جن کے کان خوف سے بالکل ناآشنا تھے اب ہر وقت کسی نامعلوم خوف سے ہراساں رہنے لگے۔ وہ شخص جو نازو نعمت کے عادی تھے اب مجبوراً روکھی سوکھی روٹی پر گزارہ کرنے لگے۔ ایسے افراد میں سرگ کی والدہ کا بھی شمار تھا۔

ایک روز شام کے قریب سرگ کے گھر میں بجلی کی رو بند ہو گئی سرگ نے اپنی والدہ سے کہا امی معلوم ہوتا ہے بجلی گھر کا انجن خراب ہو گیا ہے۔

"ملاقات کے کمرے کا لیمپ تو جلا کر دیکھو۔"

"امی! اس کمرے کا کیا کوئی لیمپ بھی نہیں جلتا"۔

"کیا بجلی کے گھر میں بھی تو ہڑتال نہیں ہو گئی؟"

خادم آگنیش نے کہا۔" جی ہاں! میں نے سنا ہے۔ کہ بجلی والوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے"

"آگنیش دیکھو گھر میں موم بتیاں ہیں؟"

"جی ہیں! مگر بہت تھوڑی ہے"

اَب اس گھر میں تو بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

تاریکی ــــ قیامت کی تاریکی مسلط تھی ــــ ہال میں بجلی کے قمقموں کے بجائے موم بتی کی زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اس روشنی کے گرد سرگ اور اس کی ماں دونوں بیٹھے دن کے واقعات پر غور کر رہے تھے۔ کہ باورچی خانہ سے خدام تازہ خبر لائے کہ تھوڑے دنوں کے بعد نلوں میں پانی آنا اور گوشت پکنا بھی بند ہو جائے گا۔

سرگ ان ہوشربا خبروں کو حیرت و استعجاب کی تصویر بنا ہوا سن رہا تھا۔ اب اس کے ننھے دماغ میں یہ خیال پوری طرح مسلط ہو گیا۔ کہ مزدور لوگ ضرور جادوگر ہیں ــــ بہت بڑے جادوگر جو صرف الہ دین کے چراغ ہی سے مطیع ہو سکتے ہیں اگر یہ جادوگر چاہئیں تو ایک اشارے سے ریل گاڑیاں چلنی شروع ہو سکتی ہیں اس کا باپ فوراً گھر آسکتا ہے۔ ان کے حکم سے بجلی کی رو پھر واپس آسکتی ہے اور کمرے پہلے کی طرح پھر جگمگا سکتے ہیں۔

سرگ اس بات کا متوقع بھی نہ تھا۔ جب پندرہ دن کے بعد ایک دن یک سخت معجزے رونما ہوئے۔ یعنی ٹریم کاریں چلنی شروع ہو گئیں بجلی کی رَو آ گئی اخباروں کی اشاعت از سر نو جاری ہو گئی صبح ناشتہ کے ساتھ توش ملنے لگ گئے اور اس کا باپ گھر آ گیا ــــ غرضیکہ اتنی اچھی باتیں بیک وقت ہو گئیں۔

ایک روز جب وہ اپنے آیا کے ساتھ بازاروں میں گھومنے کے لیے گیا۔ تو خلاف توقع بہت سے جادوگروں ،، آزادانہ چلتے پھرتے دیکھا۔ جو ہاتھ میں جھنڈے

پکڑے مختلف قسم کے راگ گاتے ہوئے بازاروں میں چکر لگار ہے تھے۔ وہ اب کسی سے خوفزدہ نہ تھے۔ اور نہ اب پولیس ہی انہیں ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ جب سرگ واپس آیا تو اس نے چاہا۔ کہ اب کی دفعہ اکیلا بازار میں جاکر ان جادوگروں کا تماشہ دیکھے۔

امی ــــــ میری پیاری امی! بازار میں جادوگر رہے ہیں کیا میں انہیں دیکھنے جاؤں؟"

"ہرگز نہیں!"

"امی اب تو وہ بہت برے نہیں۔"

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے ــــــ اب پہلے کی طرح امن تھا کسی قسم کی شورش یا ہڑتال رونما نہ ہوئی گھروں میں پھر خوشی کے نغمے اور قہقہے گونجنے لگے اور وہ نامعلوم خوف جو لوگوں کے دلوں پر مسلط ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو گیا۔

ایک روز سرگ بڑا اداس ہو گیا ــــــ اس کی ماں اور باپ دونوں تھیٹر گئے ہوئے تھے گھر کی خادمہ کسی کام میں مشغول تھی اور اس کی بہن اپنی گڑیوں میں کھیل رہی تھی سرگ حیران و پریشان ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا کہ وقت کاٹنے کے لیے کیا کرے۔

"دادی اماں بتایئے میں کیا کروں؟"

"آؤ میرے پاؤں دباؤ!"

"میں نہیں دباتا ــــــ پاؤں دبانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اسی خیال میں مستغرق دوسرے کمرے میں گیا اور اپنی بہن کی نئی گڑیا توڑ ڈالی۔ اس حرکت پر ماما سخت ناراض ہوئی اور اس نے اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اب وہ چاہتا تھا۔ کہ باورچی خانہ میں ہرگز ہرگز نہ جانے دے۔

سرگ نے تنگ آ کر کہا۔ "مگر میں کیا کروں ـــــ میں اکیلا ہوں۔"

"خادمہ نے سرگ سے پوچھا۔ "کیا تمہارے لیے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی؟"

"یہ کون باتیں کر رہا ہے؟"

"باورچن کا خاوند آیا ہوا ہے۔ وہی باتیں کرتا ہوگا۔"

"یہ دلچسپ چیز نہیں تو اور کیا ہے؟"

"وہ دلچسپ کس طرح ہوا ـــــ وہ معمولی سا آدمی ایک غریب مزدور۔"

"باورچن کا خاوند ایک مزدور؟"

"کیوں؟"

"ایک جادوگر ـــــ اب تو میں ضرور اندر جاؤں گا۔"

"سرگ! اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہاری اماں سے کہہ دوں گی کہ تم نے ان کی نافرمانی کی ہے۔"

"تم چغل خور بھی ہو؟" ـــــ چغل خور! کہہ کر دیکھو میں نے ابھی نہیں بتا دیا ہو کہ تم نے صبح دودھ پر بالائی اتار کر کھا لی تھی۔"

"یہ بالکل غلط ہے ـــــ میں نے دودھ میں مکھی نکالی تھی۔"

"سرگ بہت عرصے تک خادمہ سے جھگڑتا رہا مگر اس نے اسے باورچی خانے میں جانے کی اجازت نہ دی

جب خادمہ کمرے سے چلی گئی تو سرگ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور باورچی خانے کے دروازے کے قریب جا کر اُسے آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا۔ سرگ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ دروازہ ایکدم کھول دے اس لیئے وہ کچھ عرصہ سانس بند کیئے دروازے کے ساتھ لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جرأت کر کے اس نے کمرے کے اندر جھانکا۔ ایک بھدا سا آدمی میز پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ اس کی حرکت سے معلوم ہوتا تھا گویا وہ ڈر رہا ہے کہ کوئی شخص اس کا کھانا نہ چھین لے۔ اسی لیے وہ دوسرے ہاتھ سے پلیٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

سرگ حیران تھا۔ کہ وہ "جادوگر" کہاں ہے؟ ـــــ ایسا بھدا مزدور اتنا طاقت ور جادوگر نہ ہو سکتا تھا۔

اس نے باورچی خانے کے ہر گوشہ میں نگاہیں دوڑائیں۔ مگر اس شخص اور باورچن کے سوا کسی اور کو موجود نہ پایا ـــــ تو پھر اس کے یہ معنی تھے کہ وہ بدنما شخص ہی جادوگر ہے سرگ اس راز کو معلوم کرنے کے لیے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ جس پر "جادوگر" اسقدر چونکا کہ اس کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی

باورچن نے اپنے خاوند کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم کھانا کھائے چلو ـــــ ننھے آقا تمہیں کچھ نہیں کہینگے۔"

"سرگ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ہیں؟"

"اپنی امی سے مت کہیے۔ کہ یہ شخص شوربا پی رہا تھا ـــــ یہ کھانے سے بچا ہوا تھا ننھے آقا"

"یہ شخص بہت بھوکا ہے ننھے آقا! آپ کو اس پر رحم کرنا چاہیئے۔"

"کون؟"

"یہ شخص —— میرا خاوند"

"تمہارا خاوند؟"

"سرگ نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی خاطر اس شخص کو غور سے دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔ اس جادوگر نے ضرور اپنی شکل تبدیل کر رکھی ہے۔

اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ تم جادوگر ہو —— مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم جادوگر ہو!"

"مزدور نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ "کون"

"تم اور کون"

"میں ایک غریب مزدور ہوں میرے آقا!"

"لیکن تم جادوگر ہو —— مجھے یقین ہے کہ تم جادوگر ہو تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ یہ سب حرکتیں تمہاری تھیں لیکن دیکھو اب ایسی حرکت نہ کرنا —— بغیر بجلی کے گھر میں سخت اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اور کارخانے بند ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے بسکٹ نہیں ملتے۔"

"جناب! میں نے تو ایسی حرکت کبھی نہیں کی —— میں ابھی جاتا ہوں۔"

"تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔ تم تو کسی سے خوفزدہ ہی نہیں ہوتے۔ میرا خیال تھا کہ تم مکان جتنے بڑے ہو گے مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم نے شکل تبدیل کر رکھی ہے۔"

"آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں صرف اس لیے کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ اس طرح مذاق اڑانا گناہ ہے۔ میرے آقا!"

"میں نے خیال کیا تھا کہ تم سنجیدہ ہو گیے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم مسخرے بھی ہو۔ شوربا پیتے وقت تمہارے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لیے میں تم سے ذرہ بھر خوفزدہ نہیں۔"

"اتنا کہہ کر سرگ ـــــ باورچی خانہ سے باہر نکل کر دروازہ میں کھڑا ہو گیا تاکہ اگر جادوگر اس کا تعاقب کرے۔ تو وہ جلدی سے گھر میں بھاگ جائے مگر خلاف توقع جادوگر نے اس کا تعاقب نہ کیا۔ سرگ نے مڑ کر دیکھا تو جادوگر ـــــ ہاں! وہی جادوگر ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا اور اپنے آنسوؤں کو اپنی غلیظ آستین سے صاف کر رہا تھا۔

"ایک جادوگر ہو کر تم رو رہے ہو۔ اچھا ہوا تمہیں ایسی ہی سزا ملنی چاہیئے۔ تم نے میرے ابا کو گھر میں کیوں نہ آنے دیا تھا ـــــ تم نے بجلی کی رو کیوں بند کر دی تھی؟ تم نے میرے بسکٹ بنانے کیوں بند کر دیے تھے؟ اب تمہیں خدا نے خوب سزا دی ہے ـ روؤ! اور خوب روؤ! ـــــ"

یہ کہہ کر سرگ خوشی کے نعرے مارتا ہوا گھر میں چلا گیا اور خادمہ کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"اب میں اس جادوگر سے نہیں ڈرتا ـــــ ذرہ بھر نہیں ڈرتا۔"

پچرنکوف

ماہی گیر

فرانسیسی شاعر وکٹر ہیوگو کی ایک نظم کے تاثرات

سمندر رو رہا تھا۔ مقید لہریں پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری کر رہی تھیں۔ دور پانی کی رقصاں سطح پر چند کشتیاں اپنے دھندلے اور کمزور بادبانوں کے سہارے بے پناہ سردی میں ٹھٹھری ہوئی کانپ رہی تھیں۔ آسمان کی نیلی قبا میں چاند کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ ستاروں کا کھیت اپنے پورے جوبن میں لہلہا رہا تھا ــــــ فضا سمندر کے نمکین پانی کی تیز بو میں لپٹی ہوئی تھی۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر چند شکستہ جھونپڑیاں خاموش زبان میں ایک دوسرے سے اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کر رہی تھیں ــــــ یہ ماہی گیروں کے سر چھپانے کی جگہیں تھیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا جس میں سے چاند کی چند آوارہ شعاعیں زمین پر رینگ رینگ کر اس کی کاجل ایسی فضا کو نیم روشن کر رہی تھیں۔ اس اندھی روشنی میں دیوار پر ماہی گیر کا جال نظر آ رہا تھا اور ایک چوبی تختے پر چند تھالیاں جھلملا رہی تھیں۔

جھونپڑی کے کونے میں ایک ٹوٹی چارپائی تاریک چادروں میں ملبوس اندھیرے میں سر نکالے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں بچھے ہوئے ٹاٹ پر پانچ بچے محوِ خواب تھے ـــــ ننھی روحوں کا ایک گھونسلا جو خوابوں سے تھر تھرا رہا تھا پاس ہی ان کی نامعلوم ماں نہ معلوم کن خیالات میں مستغرق گھٹنوں کے بل بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

یکایک وہ لہروں کا شور سن کر چونکی ـــــ بوڑھا سمندر کسی آنے والے خطرے سے آگاہ سیاہ چٹانوں، تند ہواؤں اور نصف شب کی تاریکی کو مخاطب کرکے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بچوں کے پاس جاکر ہر ایک پیشانی پر اپنے سرد لبوں سے بوسہ دیا اور وہیں ٹاٹ کے ایک کونے میں بیٹھ کر دعا مانگنے میں مصروف ہوگئی لہروں کے شور میں یہ الفاظ بخوبی سنائی دے رہے تھے۔

"اے خدا! ـــــ اے بیکسوں اور غریبوں کے خدا ان بچوں کا واحد سہارا رات کا تاریک کفن اوڑھے سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیل رہا ہے ـــــ موت کے عمیق گڑھے میں پاؤں لٹکائے صرف ان کی خاطر وہ ہر روز اس دیو کے ساتھ کشتی لڑتا ہے ـــــ اے خدا تو اس کی جان حفاظت میں رکھیو ـــــ آہ اگر یہ صرف نوجوان ہوتے ـــــ اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے!!"

یہ کہہ کر خدا معلوم اسے کیا خیال آیا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ گئی اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تھرائی آواز میں کہنے لگی بڑے ہو کر ان کا بھی یہی شغل ہوگا پھر مجھے چھ جانوں کا خطرہ لاحق رہیگا ـــــ آہ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ غربت! غربت!!۔

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی غربت اور تنگ داماتی کے خیالات میں غرق ہو گئی۔ دفعتاً وہ اس اندھیرے میں خواب سے بیدار ہوئی۔ اس کے دماغ میں ہوٹلوں کی دیو قامت عمارتیں اور امراء کے راحت کدوں کی تصویریں کھچ گئیں۔ ان عمارتوں کی دلفریب راحتوں اور امراء کی تعیش پرستیوں کا خیال آتے ہی اس کے دل پر ایک دھندسی چھا گئی۔ کلیجے پر کسی غیر مرئی ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے سے تاریکی میں آوارہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

اس کی یہ حرکت خیالات کی آمد کو نہ روک سکی۔ وہ سخت حیران تھی کہ لوگ امیر اور غریب کیوں ہوتے ہیں جبکہ ہر انسان ایک ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے حل کیلئے اس نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا۔ مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ ایک اور چیز جو اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ جب اس کا خاوند اپنی جان پر کھیل کر سمندر کی گود سے مچھلیاں چھین کر لاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مارکیٹ کا مالک بغیر محنت کئے ہر روز سینکڑوں روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ کہ محنت تو کریں ماہی گیر اور نفع ہو مارکیٹ کے مالک کو رات بھر اس کا خاوند اپنا خون پسینا ایک کر دے اور صبح کے وقت آدھی کمائی اس کی بڑی توند میں چلی جائے

——— ان تمام سوالوں کا جواب نہ پا کر وہ ہنس پڑی اور بلند آواز میں کہنے لگی :۔

"مجھ بے عقل کو بھلا کیا معلوم ہو یہ سب، خدا جانتا ہے مگر ———" اس کے بعد وہ کچھ کہنے والی تھی کہ کانپ اٹھی "اے خدا میں گنہگار ہوں تو جو کرتا ہے بہتر

کرتا ہے ۔۔۔ ایسا خیال کرنا کفر ہے"۔

یہ کہتی ہوئی وہ خاموشی سے اپنے بچوں پاس آکر بیٹھ گئی اور ان کے معصوم چہروں کی طرف دیکھ کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

باہر آسمان پر کالے بادل مہیب ڈائنوں کی صورت میں اپنے سیاہ بال پریشان کیے ہیکڑ کاٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بادل کا ٹکڑا چاند کے درخشاں رخسار پر اپنی سیاہی مل دیتا تو فضا پر قبر کی تاریکی چھا جاتی سمندر کی سیمیں لہریں گہرے رنگ کی چادر اوڑھ لیتیں۔ اور کشتیوں کے مستولوں پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اچانک تبدیلی دیکھ کر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیتیں۔ ماہی گیر کی بیوی نے اپنے میلے آنچل سے آنسوؤں خشک کیے اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ آیا دن طلوع ہوا ہے یا نہیں کیونکہ اسکا خاوند طلوع کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر واپس آجایا کرتا ہے۔ مگر صبح کا ایک سانس بھی بیدار نہ ہوا تھا۔ سمندر کی تاریک سطح پر روشنی کی ایک دھاری بھی نظر نہ آرہی تھی۔ بارش کاجل کی طرح تمام فضا پر برس رہی تھی ۔۔۔ بوڑھا سمندر کھانس رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑی اپنے خاوند کے خیال میں مستغرق رہی۔ جو اس بارش میں اور سمندر کی تند موجوں کے مقابلے میں لکڑی کے ایک معمولی تختے اور کمزور بادبان سے مسلح تھا۔ وہ ابھی اس کی عافیت کیلئے دعا مانگ رہی تھی کہ یکایک اس کی نگاہیں گہرے اندھیرے میں ایک شکستہ جھونپڑی کے سائے کی طرف اٹھیں۔ جو تاروں سے محروم آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے لرز رہا تھا۔

اس جھونپڑی میں روشنی کا نام تک نہ تھا۔ کمزور دروازہ کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تنکوں کی چھت ہوا کے دباؤ تلے دوہری ہو رہی تھی۔

"آہ خدا معلوم بیچاری بیوہ کا کیا حال ہے ــــــ اسے کئی روز سے بخار آرہا ہے۔"

ماہی گیر کی بیوی زیر لب گنگنائی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید کسی روز وہ بھی اپنے خاوند سے محروم ہو جائے کانپ اٹھی۔

وہ شکستہ جھونپڑی ایک بیوہ کی تھی جو اپنے دو کم سن بچوں سمیت روٹی کے قحط میں اپنی موت کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی مصیبت کی جھلستی ہوئی دھوپ میں اس پر کوئی سایہ کرنے والا نہ تھا۔ رہا سہا سہارا دو ننھے بچے تھے۔ جو ابھی مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ امڈا ــــــ بارش کے بچاؤ کے لیے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا رکھ کر اور ایک اندھی لالٹین روشن کرنے کے بعد وہ جھونپڑی کے پاس پہنچی اور دھڑکتے ہوئے دل سے دروازہ پر دستک دی۔ لہروں کا شور اور تیز ہواؤں کی چیخ و پکار اس کا جواب تھی۔ وہ کانپی اور خیال کیا کہ شاید اس کی اچھی ہمسایہ گہری نیند سو رہی ہے۔

اس نے ایک بار پھر آواز دی دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب پھر خاموشی تھا ــــــ کوئی صدا، کوئی جواب اس جھونپڑی کے بوسیدہ لبوں پر نمودار نہ ہوا۔ یکایک دروازہ، جیسے اس بے جان چیز نے رحم کی لہر محسوس کی ہو متحرک ہوا اور کھل گیا۔

ماہی گیر کی بیوی جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی۔ اور اس خاموش قبر کو اندھی

لالٹین سے روشن کر دیا جسمیں لہروں کے شور کے سوا مکمل سکوت طاری تھا پتلی چھت سے بارش کے قطرے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں سیاہ زمین کو تر کر رہے تھے ـــــ فضا میں ایک مہیب خوف سا لنس لے رہا تھا۔

ماہی گیر کی بیوی اس خوفناک سماں کو دیکھ کر جو جھونپڑی کی چار دیواری میں سمٹا ہوا تھا۔ سر تاپا ارتعاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلکے اور بے اختیار اچھل کر بارش کے ٹپکتے ہوئے قطروں کے ساتھ ہم آغوش ہو گئے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور دردناک آواز میں کہنے لگی :۔

"آہ لب ـــــ تو ان بوسوں کا جو جسم کو راحت بخشتے ہیں۔ ماں کی عبادت، گیت، تبسم، محبت اور ان فلک بوس عمارتوں کا جو ہماری طرف اپنی بیسیوں منور آنکھوں سے دیکھا کرتی ہیں ہنسی اور ناچ کا ایک ہی انجام ہے ـــــ یعنی قبر لب ـــــ آہ میرے خدا!"

اس کے سامنے پھوس کے بستر پر بیوہ کی سرد لاش اکڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے پہلو میں دو بچے محو خواب تھے۔ لاش کے سینے میں ایک آہ! کچھ کہنے کو رُکی ہوئی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھیں جھونپڑی کی خستہ چھت کو چیر کر تاروں سے محروم آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے انہیں کچھ پیغام دینا ہو۔

ماہی گیر کی بیوی اس وحشت خیز منظر کو دیکھ کر چلا اٹھی۔ تھوڑی دیر دیوانہ وار ادھر ادھر گھومی یکایک اس کی غمناک آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور لپک کر لاش کے پہلو سے کچھ چیز اٹھا کر اپنی چادر میں لپیٹ لی اور اس دار لخطر سے لڑکھڑاتی ہوئی

اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگ نکلی۔

چہرے کے بدلے ہوئے رنگ اور لرزاں ہاتھوں سے اس نے اپنی جھولی کو میلے بستر پر خالی کر دیا۔ اور اس پر پھٹی ہوئی چادر ڈال دی تھوڑی دیر بعد وہ سے چھینی ہوئی چیز کی طرف دیکھ کر وہ اپنے بچوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

طلوع سمندر کے افق پر سپید ہو رہا ہے سورج کی دھندلی کرنیں تاریکی کا تعاقب کر رہی تھی۔ ماہی گیر کی بیوی بیٹھی اپنے احساس جرم کے شکستہ تار چھیڑ رہی تھی۔ ان غیر مربوط الفاظ کے ساتھ سنہری لہریں اپنی مغموم تانیں ملا رہی تھیں۔

آہ! میں نے بہت بڑا کام کیا ہے مگر اب مجھے مارے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی ـــــ اور یہ بھی عجیب ہے کہ میں اس سے خائف ہوں جس سے محبت کرتی ہوں ـــــ کیا واپس چھوڑ آؤں؟ ـــــ نہیں ـــــ شاید وہ معاف کر دے۔"

وہ اس قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی ہوئی تھی کہ ہوا سے دروازہ ہلا پھر دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سا رہ گیا۔ اٹھی اور کسی کو نہ پاکر پھر وہیں متفکر بیٹھ گئی۔

"وہ ابھی نہیں ـــــ بیچارہ ـــــ اسے ان بچوں کے لیے کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے ـــــ اکیلے آدمی کو سات پیٹ پالنے پڑتے ہیں اور ـــــ مگر یہ شور کیا ہے؟"

یہ آواز چیختی ہوئی ہوا کی تھی جو جھونپڑی کے ساتھ رگڑ کھا کر گزر رہی تھی۔

"وہ اس قدموں کی چاپ! آہ نہیں، ہوا ہے" یہ کہہ کر وہ پھر آپنے اندرونی غم میں

ڈوب گئی۔ اب اس کے کانوں میں ہواؤں اور لہروں کا شور مفقود ہو گیا۔ سینے میں مختلف خیالات کا تصادم کیا کم شور تھا۔

آبی جانور ساحل کے آس پاس چلاّ رہے تھے۔ پانی میں گھلے ہوئے سنگریزے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کھنکھنا رہے تھے کشتی کے چپوؤں کی آواز صبح کی خاموش فضا کو مرتعش کر رہی تھی ۔۔۔۔ ماہی گیر کی بیوی کشتی کی آمد سے بےخبر اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتہً دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا ۔۔۔۔ صبح کی دھندلی شعاعیں جھونپڑی میں تیرتی ہوئی داخل ہو گئیں۔ ساتھ ہی ماہی گیر کاندھوں پر ایک بڑا جال ڈالے دہلیز پر نمودار ہوا۔

اس کے کپڑے رات کی بارش اور سمندر کے نمکین پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ آنکھیں کم خوابی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ جسم سردی اور غیر معمولی مشقت سے اکڑا ہوا تھا۔

"نسیم کے ابا! تم ہو!" ماہی گیر کی بیوی چونک اٹھی! اور عاشقانہ بیتابی سے اپنے خاوند کو چھاتی سے لگا لیا۔

"ہاں میں ہوں پیاری!"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر کے کشادہ مگر مغموم چہرے پر مسرّت کی ایک دھندلی سی روشنی چھا گئی وہ مسکرایا ۔۔۔۔ بیوی کی محبت نے اس کے دل سے رات کی کلفت

کا خیال محو کر دیا تھا۔

"موسم کیسا تھا۔" بیوی نے محبت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔
"تند"
"مچھلیاں ہاتھ آئیں۔"

"بہت کم — آج رات تو سمندر قزاقوں کے گروہ کی مانند تھا۔"
یہ سن کر اس کی بیوی کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ماہی گیر نے اسے متعدم دیکھا اور مسکرا کر بولا۔"

"تو میرے پہلو میں ہے — میرا دل خوش ہے۔"
"ہوا تو بہت تیز ہو گئی۔"

بہت تیز معلوم ہو رہا تھا۔ کہ دنیا کے تمام شیطان مل کر اپنے منحوس پر پھیلا پھڑا رہے ہیں — جال ٹوٹ گیا۔ رسیاں کٹ گئیں اور کشتی کا بھی تو ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ پھر اس گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے،" مگر تم شب بھر کیا کرتی رہی ہو پیاری؟"
بیوی کسی چیز کا خیال کر کے کانپی اور لرزاں آواز میں جواب دیا۔ "میں! — آہ کچھ بھی نہیں — سلیں پروتی رہی، تمہاری راہ تکتی رہی — لہریں بجلی کی طرح کڑک رہی تھیں — مجھے ڈر لگ رہا تھا۔
"ڈر — ہم لوگوں کو ڈر کس بات کا — اور ہاں ہماری ہمسایہ بیوہ مر گئی ہے،" بیوی نے اپنے خاوند کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔"
"ماہی گیر نے یہ دردناک خبر سنی مگر اسے کچھ تعجب نہ ہوا شاید اس لیے کہ وہ ہر گھڑی

اس عورت کی موت کی خبر سننے کا متوقع تھا۔ اس نے آہ بھری اور صرف اتنا کہا وہ بیچاری سدھار گئی۔

”وہاں دو بچے چھوڑ گئی ہے جو لاش کے پاس لیٹے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر ماہی گیر کا جسم زور سے کانپا اور اس کی صورت سنجیدہ و متفکر ہو گئی۔ ایک کونے میں اپنی اونی لوپی جو پانی سے بھیگ رہی تھی پھینک کر سر کھجلانا شروع کر دیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے آپ سے بولا:۔

”وہ پانچ بچے تھے۔ اب سات ہو گئے —— اس سے پیشتر ہی اس تند موسم میں ہمیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا اب! مگر، خیر —— یہ میرا قصور نہیں۔ اس قسم کے حوادث بہت گہرے معانی رکھتے ہیں۔“

وہ کچھ عرصے تک اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دبائے سوچتے رہا۔ اسے یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ خدا نے ان بچوں سے جو اس کی مٹھی کے برابر بھی نہیں ماں کیوں چھین لی ہے —— ان بچوں سے جو نہ کام کر سکتے ہیں۔ اس کا دماغ ان سوالوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا ۔

”شاید ایسی چیزوں کو ایک عالم ہی سمجھ سکتا ہے اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔ پیاری جاؤ انہیں یہاں لے آؤ وہ کس قدر وحشت زدہ ہونگے اگر صبح اپنی ماں کی لاش پر بیدار ہوئے تو ان کی ماں کی روح سخت بے قرار ہو گی۔ —— جاؤ ابھی لے آؤ۔“

یہ کہہ کر وہ دل میں سوچنے لگا کہ وہ ان بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے گا وہ بڑے ہو کر اس کے گھٹنوں پر چڑھنا سیکھ جائیں گے۔ خدا اُن اجنبیوں کو جھونپڑی میں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ اور انہیں زیادہ کھانے کو عطا کرے گا۔

"تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیئے پیاری ۔۔۔۔ میں پیاری زیادہ محنت سے کام کروں گا۔" اور پھر اپنی بیوی کو چارپائی کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا۔ "مگر تم سوچ کیا رہی ہو ۔۔۔۔ اس دھیمی چال سے نہیں چلنا چاہیئے تمھیں۔"

ماہی گیر کی بیوی نے چارپائی کے پاس پہنچ کر چادر کو اُلٹ دیا۔ "وہ تو یہ ہیں۔" دو بچے صبح کی طرح مسکرا رہے تھے۔۔۔

"تماشا"

طبعزاد

تماشا

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پَر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونین حادثہ کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس گشت ہیبتناک سماں پیش کر رہی تھی وہ بازار جو آج سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پُر ہوا کرتے تھے اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سونے پڑے تھے۔

شہر کی فضا پر ایک پراسرار خاموشی مسلط تھی ——— بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد گھر کی خاموش اور پر سکون فضا سے سہما ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابا! آپ مجھے سکول کیوں نہیں جانے دیتے؟"

"بیٹا آج سکول میں چھٹی ہے۔"

"ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتلایا ہی نہیں۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائیگا اسے سخت سزا دی جائے گی۔"

"وہ اطلاع دینی بھول گئے ہونگے۔"

"آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہے۔"

"ہاں ہمارا دفتر بھی آج بند ہے۔"

"چلو اچھا ہوا آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ تین چار طیارے چیختے ہوئے ان کے سر سے گزر گئے خالد ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ تین چار روسی طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی روزانہ نقل حرکت سے تنگ آکر بولا۔

ابا مجھے اِن جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ اِن کے چلانے والوں سے کہہ دیں۔ کہ وہ ہمارے گھر سے نہ گزرا کریں۔

"خوف! ــــ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد؟"

"ابا یہ جہاز بہت خوفناک ہیں آپ نہیں جانتے یہ کسی نہ کسی دن ہمارے گھر پر گولا پھینک دیں گے۔

"یہ تم نے کس سے سنا؟"

کل صبح ماما امی جان سے باتیں کر رہی تھیں کہ اِن جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں اگر انہوں نے اِس قسم کی شرارت کی تو یاد رکھیں کہ میرے پاس بھی ایک بندوق ہے ــــ وہی جو آپ نے مجھے پچھلی عید پر لا کر دی تھی۔

"ماما تو پاگل ہے ــــ میں اس سے دریافت کرونگا کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے ــــ اطمینان رکھو وہ ایسی بات کبھی نہیں کریں گے۔"

خالد کے ابا نے اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنستے ہوئے کہا۔

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا تاکہ اس روز جب کہ ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں تو اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور پوری طرح انتقام لے سکے ——— کاش یہ ننھا انتقام ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصہ میں جب ایک کمسن بچہ اپنا انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے حصہ میں خالد کا ابا اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرنے پائے جس سے خالد کو دہشت ہو۔ ماما اور بیوی کو اس قسم کی مزید ہدایت دے کر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا ہی رہا تھا کہ خادم ایک دہشتناک خبر لایا۔ کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے۔ کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش ہو کر رہیگا۔

خالد کا ابا یہ خبر سن کر بہت خوف زدہ ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا۔ کہ فضا کا غیر معمولی سکون، طیاروں کی پرواز بازاروں میں مسلح پولیس کا گشت لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خواتین آندیشوں کی آمد کسی خوفناک حادثہ کی پیش خیمہ تھیں ......

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہو گا ؟"

یہ خالد کے ابا کی طرح کسی کو بھی معلوم

نہ تھا۔ مگر پھر بھی سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہوا۔ باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا ابا کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ طیاروں کی آواز نے اسے خوف زدہ کر دیا ـــــ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سینکڑوں انسان ہم آہنگ آواز میں درد کی شدت سے کراہ رہے تھے۔

خالد طیاروں کا شور و غل سن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑ آیا۔ اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ تاکہ وہ جس وقت گولہ پھینکنے لگیں۔ تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انہیں نیچے گرا دے ـــــ اس وقت سات سال کے بچے کے چہرہ پر آہنی ارادہ قوی استقلال کے آثار نمایاں تھے۔ جو کہ حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جری سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ ـــــ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ آج اس چیز کو جو اسے عرصے سے خوف زدہ کر رہی تھی۔ مٹانے پر تلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ہی ایک جہاز سے کچھ چیز گری جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مشابہ تھی ـــــ گرتے ہی وہ ٹکڑے ہوا میں تنکوں کی طرح اڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے خالد بھاگا ہوا اوپر گیا۔ اور وہ کاغذ اٹھا کر اپنے والد کے پاس لے آیا۔ "ابا جی واہ ـــــ ماما سچ مچ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے تو گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔

خالد کے ابا نے وہ کاغذ پڑھنا شروع کیا۔ تو رنگ زرد ہو گیا ـــــ

——— ہونے والے حادثہ کی تصویر اب اسے عیاں طور پر نظر آنے لگی ۔ اس اشتہار پر صاف لکھا تھا ۔کہ بادشاہ کسی کو جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔اور اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا ۔ تو نتائج کی ذمہ دار خود رعایا ہوگی ۔ اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد ۔ اسقدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے دریافت کیا "اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا ۔کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکنگے

"خالد! اس وقت تم جاؤ ——— جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو"

"مگر اس میں کیا لکھا ہے۔

"لکھا ہے آج شام کو ایک تماشا ہوگا ۔" خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا ۔

"تماشا ہوگا ——— پھر تو ہم بھی چلیں گے نا؟"

"کیا کہا"

"کیا اس تماشا میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے ۔"

"لے چلیں گے ——— جاؤ اب کہیں جا کر کھیلو ۔

"کہاں کھیلوں ——— بازار میں آپ مجھے جانے نہیں دیتے ۔ ماما مجھ سے کھیلتی نہیں ۔ میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا ۔ اب آپ ہی بتائیں کھیلوں تو کس سے ——— شام کے وقت تماشہ تو ضرور دیکھیں گے ۔

کسی جواب کا انتظار کے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا اور مختلف کمروں میں

آوارہ پھرتا ہوا اپنے والدہ کی نشستگاہ میں چلا گیا جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وہ بازار کا مطالعہ کرنے لگا کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں مگر آمد رفت جاری ہے لوگ جلسہ میں شریک ہونے کے لیے جا رہے تھے وہ سخت حیران تھا کہ دکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیئے اس کے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اس تماشا کو دیکھنے کی خاطر جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس خیال نے کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا جس کے لیے تمام بازار بند ہیں۔ خالد کو بے چین کر دیا۔ اب وہ اس وقت کا نہایت بیقراری سے انتظار کرنے لگا۔ جب اس کا ابا اسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گزرتا گیا ـــــ وہ خونیں گھڑی قریب تر آ گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد اس کا باپ اور ماں تینوں صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے ـــــ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔

تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرہ کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا زبان سے بمشکل کہہ سکا ـــــ گولی ـــــ خالد کی ماں فرط خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی گولی کا نام سنتے ہی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے خود اس کی چھاتی میں گولی اتر رہی ہے۔

خالد اس کی آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا ابا جی چلو چلیں۔

تماشا تو شروع ہو گیا ہے"۔

"کونسا تماشا؟" خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہی تماشا جس کے اشتہار آج صبح جہاز بانٹ رہا تھا۔ کھیل تو شروع ہو گیا تبھی تو آتش بازی پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے"۔

"ابھی بہت وقت باقی ہے ——— تم شور مت کرو جاؤ ماما کے پاس جاؤ"

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانہ کی طرف روانہ ہو گیا مگر وہاں ماما کو نہ پا کر اپنے والد کی نشستگاہ میں چلا گیا۔ اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

بازار آمد و رفت بند ہونے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہے تھے ——— دور فاصلہ سے کتوں کی دردناک چیخوں میں کسی انسان کی چیخ و پکار بھی شامل ہو گئی۔

خالد اس آواز کو سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اس آواز کی جستجو کیلئے کوشش ہی کر رہا تھا۔ کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا۔ جو چیختا چلاتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا۔ اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا ——— اس کی پنڈلی پر ایک گہرا زخم تھا۔ جس سے فوارہ خون نکل رہا تھا۔

خالد یہ سماں دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا۔ بھاگا ہوا اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا "ابا! ابا! بازار میں ایک لڑکا گرا پڑا ہے۔ جس کی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے۔

خالد کا باپ یہ سنتے ہی کھڑکی کی طرف گیا اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔ بادشاہ کے خوف کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں۔ کہ اسے

سڑک پر سے اٹھا کر سامنے والی دکان کے پھٹرے پر لٹا دے۔

بے سازوبرگ افراد اُٹھانے کیلئے بادشاہ کی حکومت نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں۔ مگر اس معصوم بچے کی لاش جو اُسی کی تیغ ستم کا شکار تھی وہ ننھا پودا جو اسی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے اُسی کی عطا کردہ باد سموم سے جھلس گئی تھی کسی کے دل کی راحت جو اسی کے استبداد کے سر پنجوں نے چھین لی تھی اب اسی کی تیار کردہ سڑک پر ـــــ آہ! موت بھیانک مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک ـــــ اور بھیانک ہے۔

"ابا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟"

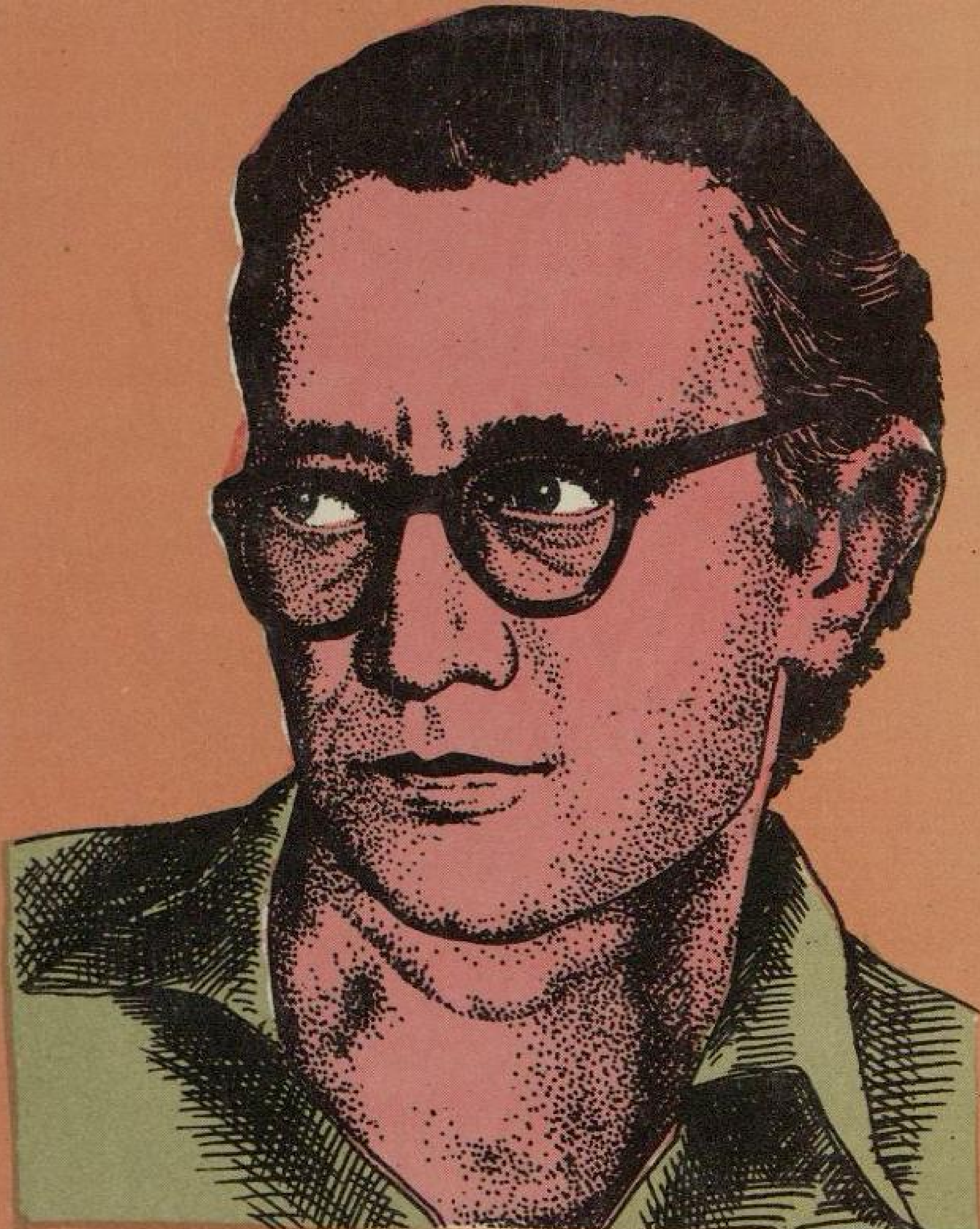
خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب خالد کمرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی جبکہ اسے ایک دفعہ قلم تراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی اور اس کی والدہ اور والد شب بھر اس کے سرہانے بیٹھے رہتے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ زخم خود اس کی پنڈلی میں ہے اور اس میں شدت کا درد ہے ـــــ یکلخت وہ رونے لگ گیا۔

خالد کے رونے کی آواز سن کر اس کی والدہ دوڑی دوڑی آئی اور اسے گود میں لے کر پوچھنے لگی۔

"میرے بچے! رو کیوں رہے ہو؟"

"اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے۔"

"شرارت کی ہو گی اس نے؟"



... زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں اگر
آپ اس سے ناواقف ہیں، تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ
ان کو برداشت نہیں کر سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ
برداشت ہے ... مجھ میں جو بُرائیاں ہیں، وہ اس عہد کی بُرائیاں ہیں
میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا
جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے ....

منٹو